کاروانِ علم وفضل کی عالمِ بقا کو روانگی

پچھلے دو ماہ کے دوران پاکستان کے سنی علمائے کرام یکے بعد دیگرے موت کی وادی میں گم ہوتے گئے۔ ''موت سے کس کو رستگاری ہے'' مگر جس انداز سے موت کا ریلا قد آور اہل علم وفضل کو بہالے گیا ہے اس سے عقل وفکر مبہوت ہو کر رہ گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں جس تعداد سے یہ سنی علمائے کرام ملک بقا کو روانہ ہوئے اس سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ علم وفضل کا ایک کارواں ہے جو موت کی وادی میں گم ہو رہا ہے۔

موت العالم موت العالم۔

''ایک عالم کی موت ایک جہان کی موت ہوتی ہے''۔

مگر جب کئی علماء موت کی وادی میں قدم رکھیں تو کئی جہانوں کی موت سامنے آتی ہے۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون ؕ

پیر کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۸-۴-۷):

عید الاضحیٰ ۱۴۱۸ھ کی صبح یہ المناک خبر لے کر آئی کہ جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ پیر صاحب علم وفضل کا ایک آفتاب جہان تاب تھے جس کی ضیاؤں نے عالم اسلام کو روشن کیا تھا۔ وہ ہمیں ''ضیاء القرآن'' دے کر گئے ''ضیاء النبی'' دے کر گئے۔ وہ ہمیں دار العلوم محمدیہ بھیرہ شریف دے کر گئے، وہ ہمیں ''ضیاء القرآن پبلی کیشنز'' دے کر گئے، وہ ہمیں ''ضیائے حرم'' دے کر گئے، وہ علامہ علوم کتاب حدیث تھے، وہ فہامہ فہوم، اصول وفروع تھے۔

نطقش چہ خوش زبان وخوش الحان وخوش بیان
ذہنش چہ نکتہ سنج و سخن فہم و نکتہ بین

حضرت پیر محمد کرم شاہ صاحب الازہری بھیروی سلطان العارفین پیر محمد شاہ ہاشمی بھیروی کے قابلِ فخر فرزندِ ارجمند تھے۔ ۲۱ رمضان ۱۹۱۸ء کو بھیرہ ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولانا محمد قاسم بالاکوٹی سے حاصل کی فلسفہ ومنطق کی فنی کتابیں حضرت مولانا محمد دین بدھوی ضلع کیمبل پور (حال اٹک) سے پڑھیں۔ مولانا غلام گودڑ پپلاں میانوالی سے ادب، فقہ اور ریاضی کا مطالعہ کیا۔ مولانا غلام محمود ان دنوں بھیرہ کے جامعہ محمدیہ غوثیہ میں پڑھا۔تے تھے۔ ۱۹۴۳ء میں بی-اے کیا۔ سندِ حدیث جامعہ نعیمیہ مراد آباد سے صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مراد آبادی سے حاصل کی۔ ۱۹۵۱ء میں جامعہ ازہر مصر میں داخلہ لیا۔ تین سال تک مصر کی اس فقید المثال یونیورسٹی میں امتیازی حیثیت سے کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں درجہ تخصیص میں سند حاصل کر کے وطن لوٹے اور اپنے مدرسہ میں سلسلۂ تعلیم وتدریس جاری کیا۔ خواجہ محمد ضیاء الدین سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ خلافت واجازت حاصل کی پھر خواجہ قمر الدین سیالوی سے اجازت وخلافت حاصل کی آپ نے تفسیر ''ضیاء القرآن'' لکھ کر دنیائے علم میں اپنی شہرت کا سکہ جمالیا۔ ''سنت خیر الانام'' نے اپنی مقبولیت پر خراج تحسین حاصل کی۔ ''پھر ضیاء النبی'' نے سیرت رسولِ پاک پر نہایت اہم مواد دیا۔ ضیائے حرم (ماہنامہ) اعلیٰ معیار پر نکال کر دنیائے صحافت میں ایک معیار قائم کیا۔ اس ماہنامے نے جہاں اپنے بلند پایہ مضامین سے قارئین کو متاثر کیا وہاں آپ کے ادارتی نوٹ ''سرِ دلبراں'' نے اہلِ علم سے خراج تحسین حاصل کیا۔ آپ عالم باعمل، باکمال مدرس اور صائب الرائے سیاستدان تھے۔ دنیائے سنیت کو آپ پر ناز رہا ہے۔ راقم آپ کی نگاہ لطف وکرم کا مرہون منت رہا ہے۔ سجادہ نشین بھیرہ شریف میرے مکتبہ نبویہ کی اشاعتی کوششوں سے متاثر ہو کر ملتے اور حوصلہ افزائی فرماتے۔ یہ میری حقیر کوششوں کا نتیجہ تھا کہ آپ نے مشہور رسالہ ''ضیائے حرم'' گنج بخش روڈ لاہور سے نکالنا شروع کیا اور مجھے مضامین لکھنے کی سعادت سے بھی نوازا۔ یہ

رسالہ سنیوں کے لیے باعثِ صد افتخار بن کر آج بھی زیور اشاعت سے مزین
ہے۔ پیر صاحب کا اداریہ ''سر دلبراں'' رسالہ کی جان ہوتا اور میں رسالہ صرف
دلبراں کے لیے پڑھتا۔

پاکستان کی سب سے بڑی شرعی عدالت کے جسٹس تھے مگر اس منصب
باوجود ان کی انکساری مثالی تھی۔ انہوں نے کئی بلند و بالا حکومتی مناصب پائے
مناصب اور علمی اعزاز ان کے علمی اور روحانی سفر میں زنجیر پا نہ بن سکے اور وہ
مقاصد کے حصول میں ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں ہوئے۔ آج وہ برملا یہ
ہوئے ہم سے جدا ہوئے ہیں۔ کہ

''شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم!''

اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑا کام لیا۔ ساری زندگی علم و عرفان کی آبیاری میں
گزاری۔ آپ کے جسم خاکی کو آپ کے خانقاہی قبرستان بھیرہ میں آپ کے والد کے
مزار کے پہلو میں سپردِ مرقد کیا گیا۔

مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۹۸ء):

مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ نعیمیہ لاہور نے سولہ مارچ ۹۸ء کو داعی اجل
لبیک کہا۔ آپ جامعہ نعیمیہ کے بانی اور دارالعلوم سراجیہ (برائے مستورات) کے نگران
اعلیٰ تھے۔ مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت نے دنیائے اہلسنّت کا ایک عظیم عالم
دین، ماہر تعلیم دینیہ بلند پایہ منتظم، صاحب بصیرت دینی اور سیاسی راہنما چھین لیا۔ آپ
کی رحلت اتنا بڑا علمی نقصان ہے جس کی تلافی صدیوں تک نہیں ہو سکے گی۔

نعیمی رحمۃ اللہ علیہ سے ہماری نیازمندی اس وقت سے ہے جب آپ ''دارالعلوم نعمانیہ''
لاہور کو خیر باد کہہ کر چوک دالگراں کی جامع مسجد میں مسند تدریس بچھا کر طلبائے علوم دینیہ
کو دعوتِ تعلیم دینے لگے تھے۔ آپ نے اپنے استاد محترم صدر الافاضل سید نعیم الدین
مرادآبادی کے نام پر لاہور میں ایک تدریسی ادارہ ''جامعہ نعیمیہ'' قائم کیا اور بے سرو سامانی

کے عالم میں کام کرنے لگے۔ مولانا نعیمی مرحوم نے اپنے احباب میں سے ایک تدریسی
کام کا انتخاب کیا جو اعزازی طور پر جامعہ نعیمیہ کے ابتدائی دور میں حضرت مفتی صاحب
کے معاون بنے۔ ان دنوں مفتی صاحب تہی دست، بے نوا اور بے سرو سامان تھے مگر آپ
نے پورے عزم کے ساتھ اس کام کا آغاز کیا اور صبح سے شام تک طلبہ کی تعلیم ہی نہیں ان
کے خورد و نوش اور رہائشی اخراجات کو پورا کرنے کیلئے بھی تگ و دو کرتے۔ بسا اوقات طلبہ
کے کھانے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو گھر کی کوئی ضروری چیز بیچ کر کھانا تیار کراتے اور طلبہ کو
کھلاتے۔ آہستہ آہستہ بعض احباب نے مفتی صاحب کا ہاتھ بٹانا شروع کیا مگر یہ لوگ
مستقل معاون نہیں تھے۔ وقتاً فوقتاً امداد کرتے جو ''حق دہد مانند مرغاں روزیت'' کے
مصداق ہوتی۔ دو سال اسی کشمکش میں گزر گئے صبح سے شام اور شام سے صبح ہوتی مفتی
صاحب اپنا سفر جاری رکھتے۔ دو سال کے بعد چوک دالگراں کے چند تاجروں نے ہاتھ
بٹانا شروع کیا اور جامعہ کے طلبہ کے خورد و نوش میں مالی تعاون کرنے لگے۔

مفتی صاحب تدریسی مصروفیتوں کے ساتھ مسجد دالگراں میں وقت کے بلند پایہ علماء
کرام اور بلند گفتار خطیبان شہر کو دعوت تقریر و خطاب دیتے۔ اس طرح آپ کے طلبہ،
اساتذہ، احباب اور علاقہ کے عام رہائشی بھی دینی مسائل سے آگاہی حاصل کرنے لگے۔
درس و تدریس کے ساتھ ساتھ مفتی صاحب نے سیاسی و دینی راہنماؤں کے لیے بڑے
بڑے اجلاس منعقد کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا اور چوک دالگران کی سڑکوں پر رات کے
وقت بڑے بڑے جلسے ہوتے جس میں لاہور کے مختلف علاقوں سے سامعین چلے آتے۔

ہم لوگ جمعہ کی نماز پڑھ کر مفتی صاحب کے پاس چوک دالگراں کی مسجد میں
چلے آتے۔ آپ کے حجرے میں مشاورتی میٹنگ ہوتی، احباب سے ملاقات ہوتی،
معاونین سے ملتے اور علماء کرام سے تعارف ہوتا۔ مفتی صاحب مرحوم کی محنت اور
ریاضت سے جامعہ نعیمیہ کو وسعت ملتی گئی اور آپ کے روابط بڑھتے گئے حتیٰ کہ برانڈرتھ
روڈ کے سنی تاجروں نے ایک بورڈ قائم کیا جو جامعہ نعیمیہ کے تمام اخراجات کی کفالت

کی ذمہ داری اٹھاتا۔ اب مفتی صاحب کو کھل کر کام کرنے کا موقع مل گیا۔

حضرت مفتی محمد حسین جامعہ نعیمیہ لاہور کے بانی شیخ الحدیث، مہتمم اور ممتاز دینی عالم دین تھے۔ وہ دینی علوم کی اشاعت کی عملی قوت کے ساتھ ساتھ سیاساتِ حاضرہ پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں سنبھل ضلع مراد آباد انڈیا میں پیدا ہوئے۔ والد مکرم ملا [illegible] حسین مرحوم سنبھل کے ایک ممتاز تاجر تھے۔ جنہیں دین اور شعائر اسلام سے دلی محبت تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو عالم دین اور مبلغ اسلام دیکھنے کے خواہاں تھے۔ ۱۹۳۳ء میں حضرت مولانا نعیمی جامعہ نعیمیہ مراد آباد میں داخل ہوئے۔ دو سال میں فارسی کی کتابیں اور سات سال میں درس نظامی پر عبور حاصل کیا۔ جامعہ نعیمیہ میں ان دنوں آپ کے [illegible] مولانا محمد یونس صاحب (جو حضرت صدر الافاضل کے وصال کے بعد جامعہ کے مہتمم اعلیٰ بنے) تدریس پر مقرر تھے۔ ان دنوں حضرت صدر الافاضل مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی علیہ الرحمہ نے چند طلبہ پر خصوصی توجہ دینے کیلئے چند ذہین طلبہ کی ایک علیحدہ جماعت بنائی جس میں حضرت مفتی محمد حسین نعیمی کے علاوہ مولانا حافظ نذیر الاکرم (مبلغ اسلام افریقہ و یورپ)، مفتی حبیب اللہ صاحب، مولانا ریاض الحسن صاحب اور مخدوم معین الدین نعیمی (مدیر سوادِ اعظم لاہور) شامل تھے۔ صدر الافاضل کی زندگی کا یہ آخرین خصوصی حلقہ طلبہ تھا۔ مفتی صاحب ۱۹۴۲ء میں سند فراغت لے کر میدانِ عمل میں نکلے۔ تعلیم کے دوران جن اساتذہ سے مفتی صاحب نے استفادہ کیا ان میں سے مولانا وصی احمد سہسرامی، مولانا محمد عمر نعیمی (مدفن کراچی) اور مولانا محمد یونس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۴۲ء میں علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری نے لاہور سے صدر الافاضل کو دار العلوم حزب الاحناف لاہور کے لیے ایک مدرس کے لیے لکھا تو صدر الافاضل نے مفتی محمد حسین نعیمی کو ۱۹۴۲ء میں لاہور بھیجا۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک دار العلوم حزب الاحناف میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۳ء تک دار العلوم نعمانیہ میں مدرس رہے۔

تحریک ختم نبوت زوروں پر تھی۔ مفتی صاحب نے صاحبزادہ سید محمود احمد رضوی کے

[illegible] کر دار العلوم حزب الاحناف اندرون دہلی دروازہ میں ایک ایسا مرکز قائم کیا۔ جہاں [illegible] اور فوج کے نوجوانوں کو تحریکِ ختمِ نبوت کی اہمیت پر ذاتی مشین پر پمفلٹ چھپوا کر [illegible] کرتے۔ آپ مارشل لاء کے دوران گرفتار کر لیے گئے۔ مگر فوجی عدالت نے بری کر [illegible] لیکن ایک دوسرے مقدمہ کی سماعت جاری تھی کہ مارشل لاء کا زور ٹوٹ گیا اور آپ بری ہو گئے۔ مفتی صاحب جیل سے رہا ہو کر آئے تو دار العلوم نعمانیہ سے استعفا دے دیا اور اپنی [illegible] چوک دالگراں میں ایک دینی دار العلوم کی بنیاد رکھی۔ اس دار العلوم میں پہلی بار جن اساتذہ نے مفتی صاحب کے ساتھ علمی دست تعاون بڑھایا ان میں حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، مولانا عبد المصطفیٰ ازہری، مولانا عبد الغفور صاحب لاہور، مولانا عبد الحی اور صاحبزادہ ارشاد حسین چوراشریف کے اسماء گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

جامعہ نعیمیہ کی بڑھتی ہوئی شہرت نے طلبہ کی ایک خاصی تعداد جمع کر لی۔ چنانچہ ۱۹۵۹ء میں مسجد میں جگہ کی کمی کی وجہ سے دار العلوم کو چوک دالگراں سے عیدگاہ چوک گڑھی شاہو میں منتقل کر لیا گیا اور اس ویران مسجد اور عیدگاہ پر طلبہ کے لیے رہائش اور تدریس کا کام ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ یہاں ایک عظیم الشان مسجد اور دار العلوم کی قابلِ رشک عمارت کی تعمیر شروع ہو گئی۔ مفتی صاحب کی شبانہ روز محنت اور خلوص نے لوگوں کے اندر بے پناہ جذبہ تعمیر و تدریس پیدا کیا چنانچہ یہاں اس وقت کے ۸ لاکھ روپے کی لاگت سے شاندار دار العلوم قائم ہو گیا۔

ان دنوں اس دار العلوم میں جناب مولانا غلام رسول صاحب سعیدی، مولانا غلام رسول قادری، مولانا احمد حسن نوری اور دیگر نامور علماء کرام مصروف تدریس تھے۔ مفتی صاحب کے نامور شاگردوں میں سے مولانا الٰہی بخش، مولانا باغ علی نسیم صاحب، مولانا ارشد پناہوی، محمد اشرف کاظمی، (مفتی کشمیر)، حافظ محمد عالم صاحب سیالکوٹی، قاری غلام رسول صاحب، مولانا فیض الحسن تنویر، مولانا عبد الحکیم صاحب شرف، مولانا محمد سعید نقشبندی (خطیب داتا گنج بخش)، صاحبزادہ حبیب اللہ خطیب سرائے عالمگیر

خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۱۹۶۷ء میں جمعیت العلماء پاکستان کی تطہیر کے لیے مفتی صاحب نے
زبردست مہم چلائی۔ وہ جمعیۃ العلماء کو ایک فعال جماعت بنانا چاہتے تھے۔ حکومت
وظیفہ خوار اور حاشیہ بردار درباری علماء سے علیحدہ کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ کی کوش
سے ملک بھر کے سنی علماء ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور جمعیۃ العلماء پاکستان کی قیا
شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی کے ہاتھ آگئی۔ چوک دالگراں کی جامع مسجد کو
اوقاف نے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ صدر ایوب کے دور میں جب تمام علماء کو حکومت
مرضی پر عید پڑھانے کو کہا گیا تو مفتی صاحب نے سخت احتجاج کیا۔ چنانچہ آ
کو دوسرے علماء کے ساتھ گرفتار کر کے مچھ جیل بلوچستان میں قید کر دیا گیا۔

آپ بڑے باہمت، مخلص اور باشعور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کی ہمت
محنت کی ترجمانی دار العلوم کی عظیم عمارت اور خوش انتظامی کرتی ہے وہ دوستوں کی
قدر کرتے اور اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے عالم اسلام کی نامور شخصیتوں کو دع
دے کر جامعہ کی مختلف تقاریب میں جمع کرتے۔ محکمہ اوقاف کی بے جا سختیوں
باوجود وہ اپنا کام کرتے جاتے اور علم دین کی اشاعت کے لیے ''اوراقِ غم''
''الخیرات الحسان'' اور کتاب الشفاء عربی میں اس وقت طباعت کرائیں جب کوئی
ان کی اشاعت کے لیے تیار نہ ہوتا تھا۔

تدریس و تقاریر کے علاوہ مفتی صاحب چاہتے تھے کہ جامعہ نعیمیہ کو مرکز تبلیغ اسلام
دیا جائے۔ ماہانہ ترجمان ہو، چنانچہ مفتی صاحب کے ایک معتقد موچی دروازہ سے ا
رسالہ ''حنفی'' شائع کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی تنگ دستی کی وجہ سے اس رسالے کی
نظامت مفتی صاحب کے سپرد کر دی۔ یہ رسالہ ایک سال چلا مگر مفتی صاحب کے ای
مضمون پر ایڈیٹر رسالہ کی باز پرس ہوئی تو وہ ڈر گیا اور ''ماہنامہ'' حنفی کی نظامت سے
صاحب کو دستبردار ہونا پڑا۔ ان دنوں یورپ کے ایک شہرت یافتہ سکالر ڈاکٹر اسد ڈلہو

سے انگریزی زبان میں ایک ماہنامہ ''عرفات'' نکالتے تھے وہ پاکستان بننے کے
جاری نہ رکھ سکے، ہمیں ڈاکٹر اسد سے شناسائی تھی چنانچہ ماہنامہ ''عرفات'' کا
شن مفتی صاحب کے نام تبدیل کرایا گیا، اس طرح یہ جامعہ نعیمیہ کا ترجمان بنا۔
یشن پر میدانِ عرفات کی جو تصویر لگی وہ ڈاکٹر اسد نے مہیا کی تھی جو انہوں نے
ہور کتاب A CRASS Road To Mecca میں شائع کی تھی۔ بعد
فظ محمد یوسف سدیدی مرحوم سے عرفات کا ٹائٹل لکھوایا گیا اور یہ ماہنامہ جاری و
رہا۔ ہمیں یاد ہے کہ کئی مضامین کے علاوہ ایک مستقل عنوان ''اور راوی بہتا رہا''
قلم راوی بن کر لکھتا گیا اور قارئین کو دعوت فکر دیتا رہا۔

مسجد اور جامعہ کی عمارات کی تعمیر اگرچہ بہت بڑا منصوبہ تھا مگر مفتی صاحب مرحوم
ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر کی تنصیب کی نگرانی کرتے۔ ہاتھوں میں تیشہ و
لے کر ان کوتاہیوں کو دور کرتے جو معماروں اور مزدوروں کی نظر سے بچ
۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جامعہ نعیمیہ کی تعمیر و تکمیل میں زندگی وقف کر دی، طلبہ
داد بڑھتی گئی، اساتذہ آتے گئے، تعلیم کا معیار بلند ہوتا گیا، تدریس کے زاویے
تے گئے اور آپ کی قابلیت، محنت، بصیرت اور شخصیت آسمان شہرت کی بلندیوں کو
گئی۔ آپ نہایت مستقل مزاجی سے اس شاہراہ پر گامزن رہے حتیٰ کہ ایک دن آیا
اپنے احباب، علماء و مشائخ، اساتذہ و تلامذہ، لائق فرزندوں، جانشینوں ہزاروں
ندوں اور لاکھوں غمگساروں کے عظیم الشان اجتماع کے سامنے جامعہ نعیمیہ کے
حفظ و قرات کے دامن میں ابدی نیند کی گود میں چلے گئے۔

''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!''

نا احمد حسن نوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۹۹۸ء):

مولانا احمد حسن نوری علیہ الرحمہ مغلپورہ لاہور کی ایک جامع مسجد پوسٹ آفس کے
ب تھے۔ سادہ مزاج، مخلص اور محنتی عالم دین تھے۔ آپ نے تیس سال سے زیادہ

آپ کی رفاقت میں رہے۔ یہاں مولانا نے تمام علوم منقولات اور معقولات کی تکمیل کی۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا سردار احمد لائلپوری رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسہ منظر الاسلام رضویہ لائل پور میں دورۂ حدیث پڑھا اور دستارِ فضیلت ۱۹۵۶ء میں حاصل کی اور پھر لاہور چھاؤنی لاہور میں مولوی جان محمد کی مسجد میں خطیب مقرر ہوئے۔ ایک سال آپ نواب شاہ سندھ میں بطور خطیب اور مدرس کی خدمات انجام دیں۔ مگر لاہور کی کشش نے آپ کو پھر کھینچا اور مسجد رام گڑھ میں خطیب مقرر ہوئے۔ شیخ الحدیث مولانا غلام رسول صاحب رضوی لائل پور منتقل ہوئے تو آپ مدرسہ نظامیہ رضویہ میں مدرس اور ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں مولانا اعجاز ولی خان مرحوم کے مشورہ پر ''مکتبہ حامدیہ'' قائم کیا اور راقم کے اصرار پر گنج بخش روڈ پر چلے آئے۔ مکتبہ کی مصروفیت سے آپ نے جامعہ نظامیہ سے استعفاد ے دیا اور ہمہ تن اشاعت کتب میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے خون کے آنسو، مسلک امام ربانی اور مسلم الثبوت جیسی کتابیں طبع کرائیں۔ جواہر البحار فی فضائل نبی المختار تصنیف علامہ امام یوسف نبہانی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ چھپوا کر ۱۹۷۳ء میں حج کیا۔ مکتبہ حامدیہ کے ساتھ ساتھ جامعہ شیرازیہ لاہور میں اعزازی مدرس رہے۔ تصنیف وتالیف کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ جمعہ کی خطابت کو باقاعدگی سے ادا فرماتے اور تقریر و بیان سے عمر بھر وابستگی رکھی۔ آپ عالمانہ تقریر کرتے اور اہلِ علم و دانش سے داد پاتے۔ وہ نظریاتی اعتبار سے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے پیروکار تھے۔ سیاسی دنیا میں ''جمعیت علماء پاکستان'' سے وابستہ تھے۔ جمعیت علمائے پاکستان کی شکست وریخت کے باوجود انہوں نے آخری دم تک اس کا ساتھ دیا۔ قائدِ اہلسنّت، صدر جمعیت علمائے پاکستان مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی سے انہیں قلبی لگاؤ تھا۔ وہ ان کی محبت وعقیدت اور سیاسی نظریات پر پورا یقین رکھتے تھے۔ جب علمائے اہلسنّت کی اکثریت مولانا نورانی سے منہ پھیر کر انتشار اور افتراق کی وادی میں گم ہوگئی تو آپ دل گرفتہ ہو کر کڑھتے اور خون کے آنسو روتے۔ مولانا شاہ

احمد نورانی کی عظمت کو سلام کرتے، مولانا شاہ احمد نورانی بھی آپ کے خلوص محبت اور اخوت کی قدر کرتے تھے اور انہیں اپنے محبوب ترین احباب میں شمار کرتے۔ مولانا دار الاسلام کی موت سے دنیائے اہلسنّت کے علمی سرمایہ کا ناشر اور جمعیت علمائے پاکستان کا ایک جانباز سپاہی چھن گیا، جس کی ایک عرصہ تک کمی محسوس کی جائے گی۔

مولانا خلیل احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۸-۳-۲۶):

امین الحسنات مولانا خلیل احمد قادری حضرت مولانا ابوالحسنات قادری رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے فرزند ارجمند اور اپنے والدِ محترم کی رحلت کے بعد تادمِ حیات مسجد وزیر خان کے خطیب رہے۔ مرکزی دار العلوم حزب الاحناف لاہور سے دستارِ فضیلت حاصل کی اور حکمت میں اپنے والدِ مکرم کے مخصوص نسخوں اور طریق علاج کے امین رہے۔ آپ نے جوانی کے دور میں دینی تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ ''تحریکِ ختمِ نبوت'' میں ایک مجاہد کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ گرفتار ہوئے، لاہور کے قلعہ کے عقوبت خانہ میں رہے اور عذاب کی تکالیف کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ مارشل لاء نے انہیں سزائے موت کا حکم سنایا مگر ثابت قدم رہے۔ والدِ مکرم مولانا ابوالحسنات کے حکم پر تحریکِ ختم نبوت میں ایک طویل عرصہ تک پس دیوار زنداں رہے۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے خلیل احمد قادری ابتلائی منازل سے بڑی پامردی سے گزرے۔ لاہور میں مسجد وزیر خان کے پاس ''دار العلوم حسنات العلوم'' قائم کیا۔ مسجد کی خطابت کو تادمِ زیست اپنایا۔ ''تفسیر الحسنات'' کے آخری حصوں کو مکمل کیا اور انہیں چھپوایا۔ آپ اپنے والد مولانا ابوالحسنات اپنے دادا مولانا سید دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ کی مسند خطابت پر عمر بھر قائم رہے۔

(''جہانِ رضا'' اپریل، مئی ۱۹۹۸ء)

''میری زندگی کے چار مقاصد ہیں: قرآن کا حفظ کرنا، دینی علوم کی تحصیل وتدریس، حج بیت اللہ شریف اور شہادت اور الحمدللہ، مجھے پہلی تین چیزیں میسر ہیں، مگر شہادت کی سعادت حاصل نہیں کر سکا۔ مجھے اس کی تمنا ہے، اگر آپ کلمۂ حق پر شہادت کا رتبہ دے سکیں تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی''۔ بادشاہ نے مولانا یار محمد اور دوسرے سنی علماء کرام کو گرفتار کر کے پسِ دیوارِ زندان بھیج دیا۔

شاہی مسجد پر شیعوں کی امامت کا تنازعہ:

بادشاہ کے اس رویہ پر لاہور کے علاوہ پنجاب بھر کے علماء نے احتجاج کیا۔ ان دنوں لاہور میں ایک لاکھ افغان موجود تھے۔ انہوں نے بادشاہ کے فیصلے پر مزاحمت کرنے کا اعلان کیا مگر بادشاہ نے حکم دیا کہ لاہور کے قاضی القضاہ (چیف جسٹس) اور بادشاہ کے بیٹے شہزادہ عظیم الشان بذات خود بادشاہی مسجد میں جائیں اور کسی عالم دین کو لے جا کر خطبہ جمعہ میں ''علی ولی اللہ وصی رسول اللہ'' کا اضافہ کریں۔ جمعہ کے دن جب ایک عالمِ دین کو لے کر بادشاہی مسجد میں قاضی القضاۃ اور شہزادہ عظیم الشان پہنچے تو ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر جمعہ کا خطبہ پڑھنے کے لیے آنے والے عالمِ دین کا سر قلم کر دیا۔ اب بادشاہ نے ۱۲۲ اکتوبر ۱۷۱۱ء کو اعلان کیا کہ ''بادشاہی مسجد لاہور میں وہی خطبہ پڑھا جائے گا جو اورنگزیب کے عہدِ حکومت میں پڑھا جاتا تھا''۔

لاہور کی مساجد سکھوں کے قبضہ میں:

مغلوں کا آخری دور اورنگزیب کے نااہل جانشینوں کا دور تھا۔ وہ نہ تو مسلم رعایا کو اعتماد میں لے سکے، نہ غیر مسلم رعایا سے اچھا سلوک کر سکے، وہ نہ تو سرحدوں کا دفاع کر سکے، نہ اندرونی شورشوں پر قابو پا سکے۔ وہ اقتدار کی جنگ میں ایسے الجھے کہ پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔ مسلمانوں کی مساجد، قصبے، مدرسے، خانقاہیں سکھ لٹیروں کی زد میں رہے۔ انہیں کوئی روکنے اور ٹوکنے والا

نہیں تھا۔ لاہور خصوصی طور پر تباہ ہونے لگا۔ سکھوں کے حملے بڑھتے گئے مسلمانوں کی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں پامال ہو رہی تھیں۔ ایک وقت آیا کہ لاہور کی بادشاہی مسجد سکھا شاہی کا نشانہ بنی اور اسے سکھ فوجیوں کے گھوڑوں کا اصطبل بنا دیا گیا، بیگم شاہی مسجد لاہور کو بارود خانہ بنا دیا گیا، مسجد شاہ چراغ، مسجد دائی انگہ اور مسجد مائی لاڈو فوجیوں کی رہائش گاہیں بنا دی گئیں۔ لاہور ایک عرصے تک سکھا شاہی کے مظالم کا نشانہ بنا رہا۔ بادشاہی مسجد ویران ہو گئی۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ سکھ جرنیل اقتدار کی جنگ لڑتے ہوئے مسجد کے میناروں پر ''دمدمہ'' نصب کر کے شاہی قلعہ میں اپنے مخالف کو نشانہ بناتے۔ دوسری طرف سے توپوں کے گولے شاہی مسجد کے در و دیوار کو مجروح کرتے اور میناروں کو نقصان پہنچاتے۔

شاہی مسجد کی واگذاری کے بعد پہلا خطیب:

سکھوں کا دور ختم ہوا تو انگریزی اقتدار آیا، انگریزوں نے ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو ایک فرمان جاری کیا کہ آج کے بعد سکھ حکومت ختم کی جاتی ہے۔ لاہور برٹش سلطنت کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ پنجاب کی تمام رعایا اپنے مذہبی معاملات میں آزادی سے کام کر سکے گی، سکھوں نے جن مساجد کو قبضہ میں لیا تھا انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دیا جائے گا اس اعلان کے بعد بھی بادشاہی مسجد انگریزی فوجوں کا ملٹری کیمپ بنی رہی مگر ۱۸۵۱ء کو چیف کمشنر لاہور جان لارنس نے مسجد کو مسلمانوں کے حوالے کرنے کا اعلان کیا اور سید بزرگ شاہ ولد قاضی غلام شاہ کو بادشاہی مسجد کا متولی قرار دیا گیا۔

بادشاہی مسجد کی آزادی اور بحالی کے بعد مسلمانوں میں اطمینان اور سکون کی فضا قائم ہوئی اور اس تاریخی مسجد کے میناروں سے کئی سالوں کے بعد اذان کی آواز گونجنے لگی اور مسجد میں نمازیں پڑھی جانے لگیں۔ لاہور کے مسلمانوں نے بادشاہی مسجد کے صحن میں یوم تشکر منایا اور صلوٰۃ وسلام کی دلنواز آوازوں سے شاہی مسجد کے در و دیوار معمور ہونے لگے۔

مولانا احمد دین بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

بادشاہی مسجد کی آزادی کے بعد جس خطیب نے نمازِ جمعہ کا پہلا خطبہ دیا وہ ملک
کے مایہ ناز سنی عالم دین مولانا احمد دین بگوی تھے۔ مولانا احمد دین بگوی موضع بگہ ضلع
سرگودھا میں پیدا ہوئے تھے۔ دہلی میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے دارالعلوم سے
سند فضیلت لے کر لاہور آئے۔ وہ زبردست عالم دین تھے سنی العقیدہ تھے، حنفی فقہ
کے ترجمان تھے، تدریس میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے وہ چار سال تک بادشاہی مسجد کے
خطیب رہے پھر انہیں اپنے وطن مالوف بگہ جانا پڑا تو ان کے بھائی مولانا غلام محمد بگوی
(م ۱۹۰۰ء) بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔

مولانا غلام محمد بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا غلام محمد بگوی نے بادشاہی مسجد کو علم و ارشاد کا مرکز بنا دیا۔ آپ نے شاہی
مسجد کے وقار کو بحال کرنے میں شب و روز کام کیا ''تذکرہ علمائے اہلِ سُنّت لاہور''
کے مصنف نے لکھا ہے کہ مولانا غلام محمد بگوی اپنے بھائی مولانا احمد دین بگوی کی
رفاقت میں ۱۸۵۶ء میں بادشاہی مسجد کے امام وخطیب مقرر ہوئے۔ آپ نے شاہی
مسجد لاہور کو علم وفضل کا سرچشمہ بنا دیا۔ اس عظیم الشان مسجد کو علماء وطلبہ سے بھر دیا۔
آپ کی کوششوں سے بادشاہی مسجد میں دارالعلوم نعمانیہ کے طلبہ کی تدریس کا سلسلہ
شروع کیا گیا۔ آپ انجمن نعمانیہ لاہور کے بانی اور دارالعلوم نعمانیہ کے صدر مدرس بھی
تھے۔ بادشاہی مسجد کے اس دارالعلوم نے علمائے حنفی اور طلبائے اہلِ سُنّت کی ایسی
تربیت کی کہ سارا پنجاب گونج اٹھا۔

مولانا غلام محمد بگوی رحمۃ اللہ علیہ بھیرہ سرگودھا کے نزدیک قصبہ ''بگہ'' کے ایک علمی
گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ پنجاب، سرحد اور دہلی کے دینی مدارس سے مختلف علوم
سے مزین ہو کر لاہور پہنچے تو ان کی قابلیت اور علمی اہمیت کے پیشِ نظر آپ کو بادشاہی

مسجد کا خطیب بنا دیا گیا۔ آپ نے انجمن تنشار العلماء قائم کی جو لوگوں کے دینی مسائل
کا حل بتاتی، دینی راہنمائی کرتی۔ آپ نے اس سلسلہ میں حنفی علماء کا ایک بورڈ قائم کیا
جو دینی مسائل کو حل کرتے۔ ۱۸۸۷ء میں انجمن نعمانیہ لاہور نے آپ کی زندگی میں
ایک دارالافتاء قائم کیا تو اس کا بورڈ شاہی مسجد میں ہی کام کرتا تھا۔ مولانا غلام محمد بگوی
۴۰ سال تک بادشاہی مسجد کے خطیب رہے اور ۱۹۰۰ء میں فوت ہوئے۔

مولانا محمد شفیق بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا غلام محمد بگوی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے مولانا محمد شفیق بگوی بادشاہی
مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ آپ نے دینی تعلیم بھیرہ سے مکمل کی تھی۔ تکمیل علوم
لاہور سے کی۔ دارالعلوم نعمانیہ لاہور سے سند فضیلت حاصل کی۔ خواجہ شمس العارفین
سیالوی سے بیعت تھے۔ آپ بادشاہی مسجد کی بحالی کے بعد تیسرے عالم دین تھے جو
اپنی اہلیت کی وجہ سے اس اہم منصب پر فائز ہوئے۔ آپ بادشاہی مسجد کی خطابت کے
ساتھ ساتھ اعزازی طور پر سنٹرل جیل لاہور میں قیدیوں کو دینی تعلیم بھی دیتے۔ ایچی سن
کالج میں دینیات پر لیکچرز دیتے۔ آپ کے شاگردوں میں پنجاب کے جاگیرداروں اور
اعلیٰ افسروں کے بیٹے تھے جو آگے جا کر حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچے۔ آپ ۱۹۱۳ء
میں بادشاہی مسجد کی خطابت سے فارغ ہو کر بھیرہ میں شمس العلوم کے ناظم اعلیٰ ہو گئے۔

پروفیسر مولانا محمد ذاکر بگوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا محمد شفیق بگوی کی سبکدوشی کے بعد مولانا محمد ذاکر بگوی خطیب بادشاہی مسجد
مقرر ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم بھیرہ سے پائی تھی مگر لاہور کے جید علمائے کرام
سے تفسیر واحادیث کے علوم حاصل کیے۔ وہ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی اور عربی میں
مہارت حاصل کرتے رہے۔ انجمن حمایت اسلام کے ''مدرسہ حمیدیہ'' کے صدر مدرس
مقرر رہے۔ آپ حضرت خواجہ محمد دین سیالوی کے مرید تھے۔ ان سے خلافت پائی۔

۱۹۱۳ء میں بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ تادمِ حیات (۱۹۱۶ء تک)
کے فرائض سرانجام دیتے رہے وہ لاہور میں پرنس آف ویلز کی آمد پر شاہی
خطیب تھے مگر اس کے استقبالیہ اجلاس میں شرکت سے معذرت کر دی۔ آپ
میں فوت ہوئے مگر اپنے آبائی قبرستان بگہ میں دفن کیے گئے۔

پروفیسر سید احمد علی شاہ بٹالوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا محمد ذاکر بگوی کی وفات کے بعد ایک زبردست عالمِ دین مولانا
احمد علی بٹالوی بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر کیے گئے۔ آپ بٹالہ سے چل کر لاہور
تو آپ کی خطابت نے اہلِ لاہور کو گرویدہ بنا لیا۔ وہ عیسائی مشنریوں سے
کرتے اور انہیں برسرِ عام شکستِ فاش دیتے۔ ۱۸۸۲ء میں آپ نے مشن ہائی
رنگ محل لاہور کے ہیڈ ماسٹر پادری پورن چند کو ایک مناظرہ میں شکست دی اور
لاہور چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ آپ بلند پایہ خطیب، مناظرِ اسلام اور عالمِ دین
کے ساتھ ادیب، مصنف اور عربی کتابوں کے مترجم بھی تھے۔ آپ نے بادشاہی
کی خطابت کے دوران بڑی بلند پایہ کتابوں کے ترجمے کیے۔ دارالعلوم نعمانیہ
مدرسہ غوثیہ تکیہ سادھوان لاہور میں تدریسی فرائض سرانجام دیئے۔ ہر سال عید میلاد
النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر بادشاہی مسجد میں جلسۂ عام کا اہتمام کرتے اور سیرتِ رسول
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر علمائے کرام کی تقاریر کراتے۔ آپ ۱۹۲۶ء میں فوت ہوئے آپ تادم
حیات بادشاہی مسجد کے خطیب رہے۔

مولانا معوان حسین مجددی رحمۃ اللہ علیہ:

۱۹۲۶ء کو رامپور (ہندوستان) کے خانوادہ نقشبندیہ مجددیہ کے ایک فاضل عالم
دین مولانا معوان حسین مجددی رحمۃ اللہ علیہ بادشاہی مسجد کی خطابت کے لیے منتخب ہوئے۔
آپ بے مثال مقرر تھے۔ اور خانوادۂ امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علماء کرام کی

رکن تھے۔ آپ نے بادشاہی مسجد کی خطابت کے ساتھ ساتھ سلسلہ عالیہ مجددیہ
روحانی تربیت کا آغاز کیا اور آپ کے زیرِ نگاہ مراقبے اور اذکار کی مجالس قائم
کیں۔ اس طرح بادشاہی مسجد علم اور روحانیت کا مرکز بن گئی۔ پنجاب کے علاوہ
ہندوستان سے اور کابل و قندھار کے سالکانِ طریقت بھی تربیت پانے لگے۔
جنوبی ہندوستان میں شدھی تحریک چلی تو آپ لاہور چھوڑ کر رام پور چلے گئے
تحریک کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے علماء کرام کے ساتھ کام کر سکیں۔

مولانا غلام مرشد رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا معوان حسین مجددی کے بعد علامہ اقبال مرحوم نے انجمن اسلامیہ پنجاب
کو سفارش کی کہ وہ مولانا غلام مرشد کو بادشاہی مسجد کا خطیب مقرر کریں۔ چنانچہ
مولانا غلام مرشد ۱۹۲۷ء کو بادشاہی مسجد کے خطیب مقرر ہوئے۔ وہ ایک عرصہ تک
دارالعلوم نعمانیہ لاہور میں تدریسی فرائض سرانجام دے چکے تھے۔ مولانا غلام مرشد
سرگودھا کے ایک گاؤں انگہ میں ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت خواجہ
اللہ بخش تونسوی کے مرید تھے۔ اپنے مرشد سے ارادت کی وجہ سے بیٹے کا نام ''غلام
مرشد'' رکھا۔ مولانا غلام مرشد بڑے ذہین اور فطین تھے۔ قرآن حفظ کیا۔ درسی کتابیں
پڑھیں۔ پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے لاہور پہنچے۔ اورینٹل کالج لاہور کے قابل اساتذہ سے
عربی میں مہارت پیدا کی۔ درسی کتابوں کو پڑھا۔ مولوی فاضل کیا۔ درس نظامی
مکمل کیا پھر لاہور سے نکل کر دہلی، رامپور، اجمیر شریف اور مراد آباد سے مختلف علوم پر
عبور حاصل کیا۔ لاہور کے دارالعلوم نعمانیہ کے صدر مدرس بنے اور بیس سال تک مسندِ
تدریس پر فائز رہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پاک و ہند میں مختلف سیاسی اور دینی تحریکیں ابھر
رہی تھیں۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن بنے، ''تحریکِ خلافت'' میں شرکت کی۔
انہیں دنوں حجازِ مقدس میں نجدیوں نے جنت البقیع کو پامال کر دیا۔ صحابہ کرام
کے مزارات کو پیوست زمین کر دیا، ان کی اس جارحیت پر سارا عالم اسلام تلملا اٹھا۔

ہندوستان میں زبردست تحریک چلی، لاہور میں مظاہرے ہونے لگے۔ مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر روزنامہ ''زمیندار'' نجدیوں کی حمایت کر رہا تھا اور مولوی غلام مرشد ان کی تائید کرتے تھے۔ اس سے برِصغیر کے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو رہے تھے۔ یہ دونوں دینی راہنما ان پر نمک پاشی میں مصروف تھے۔ مولانا غلام مرشد کو دار العلوم نعمانیہ سے علیحدہ کر دیا گیا۔ جو بھاٹی دروازے کی اونچی مسجد میں درس دینے لگے مگر نہ سکے۔ پھر وہ کناری بازار کی مسجد میں درسِ قرآن دینے لگے مگر مقامی علماء سوالات کی زد میں آ کر پریشان رہنے لگے۔ دوسری طرف وہ عوام الناس کی حمایت سے محروم ہو گئے، ان دنوں آپ کے نامور شاگردوں میں سے ڈاکٹر محمد دین تاثیر، مولانا محمد بخش مسلم، ایم مسعود کھدر پوش، ڈاکٹر سید عبداللہ اور دوسرے کئی آپ کے حلقۂ درس میں آئے، مگر مولانا غلام مرشد کا مضبوط دینی حلقہ بکھر گیا تھا آپ کی علمی مسند بھی خالی ہو گئی۔

علامہ اقبال نے آگے بڑھ کر اس عالمِ دین کو بادشاہی مسجد کا خطیب بنوا دیا آپ ۱۹۲۷ء کے آخر میں منصب پر فائز ہو گئے اور ۱۹۵۶ء تک اسی منصب پر رہے مولانا غلام مرشد کا دورِ خطابت بڑے لمبا عرصہ کا دور تھا۔ اس دوران لاہور بڑی بڑی تحریکوں کا مرکز تھا، غازی علم دین شہید، مسجد شہید گنج لاہور، علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک، تحریکِ خلافت اور سب سے بڑھ کر تحریکِ پاکستان نے لاہور کو سیاسی اور مذہبی طور پر بیدار کر دیا تھا۔ مولانا غلام مرشد ان تحریکوں میں برائے نام حصہ لیتے حالانکہ ان تمام تحریکوں کا مرکزی مقام بادشاہی مسجد تھا۔ پیر مہر علی شاہ گولڑوی نے بادشاہی مسجد کے سٹیج سے ہی مرزا قادیانی کو للکارا تھا۔ امیر ملت پیر جماعت علی شاہ علی پوری نے شاہی مسجد سے ہی شہید گنج کی تحریک کا آغاز کیا تھا۔ علامہ مشرقی کی ''عسکری تحریک'' کا اجلاس بادشاہی مسجد میں ہوا تھا۔ تحریک پاکستان کے دوران قائداعظم محمد علی جناح نے بادشاہی مسجد میں جلسۂ عام کیا تھا، پھر اسی مسجد کے قریب ۱۹۴۰ء میں منٹو

پارک میں قائداعظم کی قیادت میں مسلمانانِ برِصغیر نے قراردادِ پاکستان منظور کی تھی، ان تمام تحریکوں میں مولانا غلام مرشد کا کردار خاموش تماشائی کا سا تھا۔

پاکستان بنا تو مولانا غلام مرشد بادشاہی مسجد کے خطیب تھے بادشاہی مسجد کی از سرِ نو مرمت کا آغاز ہوا، مگر مولانا صرف خطبہ جمعہ ادا فرماتے اور گھر چلے جاتے۔ قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلی ''تحریکِ ختمِ نبوت'' چلی تو پاکستان کے تقریباً تمام علمائے کرام قید و بند میں تھے، مگر مولانا غلام مرشد ٹس سے مس نہ ہوئے۔ مولانا غلام مرشد ایک بدنصیب خطیب اور عالمِ دین تھے وہ ۳۸ سال تک بادشاہی مسجد کے خطیب رہے مگر انہوں نے ایک دینی فیصلہ نہ کیا، ایک فتوی نہ دیا، ایک کتاب نہ لکھی، کوئی دینی کام نہ کیا، دینی راہنمائی کے لیے ایک قدم نہ اٹھایا اور کسی دینی کام میں نمایاں کردار ادا نہ کیا، حالانکہ وہ عالم و فاضل تھے، حافظِ قرآن تھے۔ بقول مولانا مسلم، حافظ بخاری شریف تھے، وہ بادشاہی مسجد کی خطابت کے دوران وقت کے حکمرانوں کی خوشامد میں لگے رہے، پاکستان بنا تو میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات خان، عبدالحمید دستی اور دوسرے وزیروں کی کوٹھیوں کے اردگرد گھومتے رہتے اور دعوتیں کھاتے۔ ایک بار شاہی مسجد کے سٹیج پر انہوں نے اعلان کیا کہ مسلمان کو چاہیے کہ وہ جانوروں کی قربانی کرنے کے بجائے اپنا روپیہ ملکی دفاع میں دے دیں۔ ایک بار حکومت نے چاند دیکھے بغیر عید کرنے کا اعلان کیا تو مولنا غلام مرشد نے حکومت کے فیصلے کی تائید کی۔ ان کی ان آراء سے عام مسلمانوں کو ان سے نفرت ہو گئی لوگوں نے ان کو ''سرکاری درباری مولوی'' کہہ کر مسترد کر دیا۔

مولانا عبدالقادر آزاد (دیوبندی):

۱۹۶۳ء میں محکمہ اوقاف قائم ہوا تو بادشاہی مسجد بھی محکمہ اوقاف کی تحویل میں آ گئی۔ ان دنوں مولانا غلام مرشد کے نامور شاگرد مسعود کھدر پوش چیف آف اوقاف مقرر ہو کر آئے تو مولانا غلام مرشد کو بادشاہی مسجد سے علیحدہ کر دیا گیا پھر محکمہ اوقاف کا

ایک چھوٹا سا مولوی ''سنی عالم دین قیوم الٰہی عرفانی مرحوم'' کو بادشاہی مسجد کا خطیب
مقرر کر دیا گیا۔ مولانا عرفانی عملیات وتعویذات کے بڑے ماہر تھے وہ رات کو وظیفہ
کرتے اور دن کو اپنے افسروں پر پھونک مارتے رہتے۔ اس طرح وہ تین سال تک
بادشاہی مسجد لاہور کی خطابت فرماتے رہے، انہی دنوں بہاولپور سے ایک جوان سال
مولوی عبدالقادر آزاد اٹھے اور ایک سیاسی گروہ کے زور سے بادشاہی مسجد کے خطیب
بن گئے۔ یہ پہلے ''دیوبندی مولوی'' تھے جو اورنگزیب عالمگیر کی مسجد کے محراب ومنبر
بیٹھے نظر آئے۔ مولانا آزاد پورے تیس سال بادشاہی مسجد کے خطیب رہے۔ مولانا
آزاد نہایت ہی مستقل مزاج حکومت نواز عالم دین تھے، وہ خوشامد درآمد کے فن کو
خوب جانتے تھے اور اسے استعمال میں لاتے۔ انہوں نے اپنے تیس سالہ دور خطابت
میں ہمیشہ سرکاری لوگوں کو ہاتھ میں رکھا، جو حکومت آئی، اس کی تعریف کی، اس کے
گن گائے۔ ذوالفقار علی بھٹو آئے تو بادشاہی مسجد کے محراب ومنبر ''اسلامی سوشلزم'' کا
گہوارہ بن گئے۔ جنرل ضیاء الحق آئے تو عسکری نظام ''نظام رحمت'' تھا، وزیر اعظم
نواز شریف آئے تو بینظیر پر لعنت بھیجتے اور اسے ووٹ دینے والے کا نکاح توڑ
دیتے۔ بینظیر آئی تو اس کی جمہوریت کے لیے دعائیں کرتے، میاں نواز شریف
دوبارہ آئے تو بینظیر کا نام لینا بھی گوارا نہ کرتے۔ یہ مولانا آزاد کی سیاسی حکمت عملی تھی
جو بڑی کامیاب رہی۔ ہر آنے والے کا استقبال اور ہر جانے والے پر لعنت بھیجتے
انہوں نے اپنے تیس سالہ دور خطابت میں مولانا غلام مرشد کی طرح ایک دینی فتویٰ
بھی جاری نہ کیا، ایک کتاب نہیں لکھی، ایک دینی کام نہیں کیا، ایک دینی ادارہ قائم نہیں
کیا۔ جب حکومت نے انہیں بادشاہی مسجد سے نکالا تو نہایت حسرت ویاس سے

ع تھے دونوں ہاتھ خالی ''باہر کفن'' سے نکلے!

وہ افسروں کے محترم تھے، وہ حکمرانوں کے دعا گو تھے، وہ خوشامد کے بادشاہ
تھے، وہ اپنی عمر عزیز کو سرکاری کاغذات میں گھناتے رہے، مگر کوئی کام نہ کر سکے، وہ

ساری زندگی ''آزادانہ'' انداز میں گزار کر ''راہی ملک فراغت و بے کاری'' ہو گئے۔

''حق مغفرت کرے عجب ''آزاد' مرد تھا!''

ان کی جگہ حال ہی میں ایک دیوبندی مولوی اصغر علی عباسی بادشاہی مسجد کے
خطیب بن کر آئے ہیں، انہوں نے اپنی نوکری کو ''برحق'' ثابت کرنے کے لیے اعلان
فرمایا کہ بادشاہی مسجد ہمیشہ دیوبندی علماء کے پاس رہی ہے۔ یہ اتنا بڑا فریب ہے
کہ ایک مسجد کا خطیب زبان پر نہیں لا سکتا۔ پھر شاہی مسجد کے خطیب کو یہ بات زیب
نہیں دیتی۔ بہرحال۔

لوگ یزداں کو بیچ دیتے ہیں   اپنا مطلب نکالنے کے لیے

ہمارے ملک میں یہ ایک دینی المیہ ہے کہ جب سے مساجد محکمہ اوقاف کی تحویل میں
آئی ہیں اس دن سے امامت اور خطابت کے بجائے ''نوکریاں'' لگ گئی ہیں حکومت
کی حکمرانی کا انداز اپنا ہوتا ہے جو قابلِ ستائش نہیں مگر علمائے کرام اپنے منصب
امامت وخطابت کے بجائے ''نوکریوں'' کے حصول میں سرگرمی سے لگے ہوئے ہیں،
یہی وجہ ہے کہ آج تک بادشاہی مسجد کا ایک ''نوکر خطیب'' کوئی دینی فیصلہ نہیں دے
سکا، کوئی دینی معرکہ سرانجام نہیں دے سکا، مولانا غلام مرشد مرحوم سے لے کر آج تک
جتنے خطیب اورنگزیب عالمگیر کی بادشاہی مسجد میں آئے ہیں، وہ ''نوکری'' پکی کرنے کے
لیے، امیروں، وزیروں اور حکمرانوں کی خوشامد میں لگے رہتے ہیں یا باہر سے آنے
والے مہمانوں سے سونے کی گھڑیوں کے حصول کے لیے خوش آمدید کہتے رہتے ہیں۔

چناں نالیم اندر مسجد شہر   کہ دل در سینۂ ملا گدازیم!

(''جہانِ رضا'' دسمبر ۱۹۹۸ء)

(''اخبار اہل سنت، لاہور'' جنوری ۲۰۰۰ء)

روشنی سے ملتا جلتا انسان

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری

جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے عالمِ دین، ماہرِ تعلیم اور بلند پایہ مصنف اور مؤلف تھے۔ آپ کی ساری زندگی دینِ اسلام کی سربلندی اور قرآن واحادیث کی تفہیم واشاعت میں گزری۔ آپ عصرِ حاضر کے علمائے اہلِ سنت میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور آپ نے اپنے قلم وفکر سے لوگوں کی جس قدر راہنمائی فرمائی ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

آپ کے والدِ مکرم، پیر محمد شاہ ہاشمی بھیروی، خانوادۂ چشتی کی سیالوی نسبت میں ایک بلند پایہ روحانی راہنما تھے۔ آپ کے حلقہ ارشاد میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ روحانی تربیت حاصل کرتے رہے ہیں۔ پیر محمد کرم شاہ الازہری ۲۱ رمضان ۱۳۳۶ھ کو بھیرہ ضلع شاہ پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھیرہ میں اپنے والدِ مکرم کے زیرِ نگرانی مولانا محمد قاسم بالاکوٹی سے حاصل کی تھی پھر آپ نے وقت کے ممتاز ماہرِ تعلیم مولانا محمد دین، مولانا غلام محمود پپلاں میانوالی سے علومِ دینیہ کے مختلف شعبوں میں تعلیم حاصل کی۔ یہ علمائے دین ان دنوں بھیرہ کی جامعہ محمدیہ غوثیہ میں تعلیم وتدریس میں مصروف تھے ان دنوں مراد آباد بھارت میں صدر الافاضل سید نعیم الدین مراد آبادی کا دار العلوم ''جامعہ نعیمیہ'' بڑی تدریسی شہرت رکھتا تھا۔ چنانچہ آپ ۱۹۴۳ء میں وہاں پہنچے۔

احادیث کی کتابیں صدر الافاضل سے پڑھیں اور سند احادیث حاصل کر کے وطن لوٹے۔ آپ نے عربی علوم اور دینی مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ ۱۹۴۵ء میں بی اے کیا۔ پھر عالمِ اسلام کے بلند پایہ دار العلوم جامعہ ازہر مصر میں داخلہ لیا۔ جامعہ ازہر

میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۴ء تک زیرِ تعلیم رہ کر جامعہ ازہر کی اعلیٰ سند علمیہ وادبیہ حاصل کی۔ آپ نے ۱۹۵۵ء میں ازہر یونیورسٹی مصر سے ہی ڈاکٹریٹ کی اور ایک سال بعد وطن واپس آئے۔

آپ خانوادہ چشت میں حضرت پیر محمد ضیاء الدین سیالوی سے بیعت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اپنے پیر ومرشد کی نسبت کو اپنی زندگی کی تمام تر کامیابیوں میں نمایاں کیا۔ آپ کی تفسیر ضیاء القرآن، آپ کی سیرت پر بے مثال کتاب ''ضیاء النبی''، آپ کا ماہنامہ ''ضیائے حرم''، آپ کا اشاعتی ادارہ ''ضیاء القرآن پبلی کیشنز'' اس روحانی نسبت کا آئینہ دار ہے۔

خانوادۂ چشت کے ایک زبردست عالمِ دین خواجہ محمد قمر الدین سیالوی ملک کی سیاسی اور دینی زندگی میں قائدانہ مقام پر فائز تھے۔ آپ نے تحریکِ پاکستان میں بڑی خدمت کی۔ آپ نے تحریکِ ختمِ نبوت میں رہنمایانہ کردار ادا کیا۔ آپ نے جمعیت علمائے پاکستان کے بانی رکن کی حیثیت سے ملکی سیاست میں اہم مقام حاصل کیا۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری نے حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی کی قیادت میں جمعیت علمائے پاکستان کے سٹیج سے ملکی سیاست میں قدم رکھا۔ اور نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد شروع کی۔ خواجہ قمر الدین سیالوی ان دنوں صدر جمعیت العلمائے پاکستان تھے۔ پیر محمد کرم شاہ خواجہ سیالوی کے دستِ راست تھے۔ زیرِ قیادت تھے۔ ایک جاں نثار مرید کی حیثیت سے شب وروز کام کرتے رہتے۔ پاکستان میں نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے جب تحریک چلی تو جن علمائے کرام نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں پیر محمد کرم شاہ الازہری صفِ اول میں کھڑے تھے۔ آپ نے قید وبند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ اہل وعیال سے جدا کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ آپ کو ایک عرصہ تک شاہ پور اور سرگودھا کی جیلوں میں پسِ دیوارِ زنداں رہنا پڑا۔ شاہ صاحب کی بلند علمی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے اپنی مشہور تفسیر قرآن ''ضیاء القرآن'' قید

و بند کے دوران لکھی۔ اور اسے حافظہ کی مدد سے مختلف حوالوں سے مزین فرما کر اہل علم
وفضل کے لیے ایک بے مثال تفسیر کی حیثیت سے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا۔

ان دنوں انکارِ ختم نبوت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں ایک دینی فتنہ انکار
حدیث رسول پر مشتمل تھا۔ اس فتنہ کے سربراہ اور ترجمان مسٹر غلام احمد پرویز
جنہوں نے اپنے ماہنامہ ''طلوع اسلام'' اور دوسری کتابوں میں یہ پراپیگنڈا شروع کر
دیا کہ مسلمانوں کو صرف قرآن کی تعلیمات ہی کافی ہیں۔ حدیث نبوی اور سنت رسول
اللہ کی کوئی حیثیت نہیں اس فتنہ کے خلاف علمائے اسلام نے آواز اٹھائی۔ احتجاج کیا
اور اسے مسترد کیا۔ مگر پیر محمد کرم شاہ نے ایک زبردست کتاب ''سنت خیر الانام'' لکھی
جس میں دلائل اور شواہد کے ساتھ احادیث کی ضرورت اور مقام کو واضح کیا۔ یہ کتاب
ہزاروں کی تعداد میں کراچی سے چھپی اور ملک میں تقسیم کی گئی۔ آپ کی اس کتاب
پیر محمد کرم شاہ بھیروی کی علمی تحقیق اور حدیث رسول پر قابلیت کا لوہا علمی دنیا میں تسلیم کیا

ایسے دینی فتنوں کی آئے دن سر اٹھانے کی روش نے علمائے دین کو بڑے چیلنج سے
سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ پیر محمد کرم شاہ بھیرہ سے ۱۹۷۰ء میں لاہور آئے۔ ایک دینی اشاعتی
ادارے کی بنیاد رکھی۔ ماہنامہ ''ضیائے حرم'' جاری کیا۔ اور دینی صحافت کے آسمان پر
آپ کا یہ ماہنامہ ایک آفتاب بن کر اہل علم وفضل کے دل ودماغ کو روشن کرنے لگا۔
صاحب اس رسالے کا اداریہ ''سردلبراں'' کے عنوان سے لکھتے۔ تو علم وفضل کے دریا بہا
دیتے۔ حالاتِ حاضرہ پر روشنی ڈالتے۔ سیاسی اور دینی تحریکوں میں رہنمایانہ کردار ادا
کرتے تھے۔ آپ کے اداریے، فتنہ انکار حدیث، فتنہ ختم نبوت اور فتنہ اسلامی سوشلزم پر
کاری ضربیں لگاتے۔

تحریکِ نظامِ مصطفیٰ چلی تو آپ قائدِ اہلِ سنت الشاہ احمد نورانی کی قیادت میں
صفِ اول کے سیاسی راہنما کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے۔ قید وبند کی صعوبتوں کو لبیک
کہا۔ نظامِ مصطفیٰ کا پرچم بلند رکھا اور صبح سے شام تک ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر

آواز بلند کرتے رہے۔ آپ نے اپنے مریدوں میں سے جس کو بھی جمعیت علمائے
پاکستان کا ٹکٹ لے کر دیا وہ صوبائی اور قومی اسمبلی میں بھاری اکثریت کے ساتھ پہنچا،
یہ آپ کا سیاسی مقام تھا کہ آپ کا نمائندہ آپ کے مریدوں کے ووٹوں سے کامیاب
ہوتا۔ ۱۹۷۴ء میں آپ کا دار العلوم جامعہ محمدیہ غوثیہ بھیرہ پاکستان کی اعلیٰ درسگاہوں
میں شمار ہوتا تھا۔ جہاں سیکڑوں طلبہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ پیر محمد کرم شاہ نے کئی
سال تک اس دار العلوم کے طلبہ کو بذاتِ خود مسند تدریس پر بیٹھ کر علم وفضل سے آشنا
کیا۔ پنجاب کے پیروں میں پیر محمد کرم شاہ واحد پیر تھے جو بیک وقت پیر بھی تھے، معلم
بھی تھے، استاد بھی تھے۔ عالمِ دین بھی تھے، صاحبِ قلم ادیب بھی تھے، سیاسی راہنما
بھی تھے اور اسلامی تحریکوں میں عملی حصہ بھی لیتے تھے۔ ان دنوں ذوالفقار علی بھٹو کی
حکومت دینی مدارس پر پابندیاں لگا رہی تھی۔ ان پر قبضہ کر رہی تھی۔ اس نے پیر محمد کرم
شاہ کو بھی حکم دیا کہ ان کا دار العلوم بند کر دیا جائے گا۔ پیر صاحب نے اس وقت کی
حکومت کے اس اقدام کے جواب میں کہا کہ ''تم لوگ میرا مدرسہ چھین سکتے ہو،
دار العلوم پر قبضہ کر سکتے ہو مگر میں تو ایسا درویش ہوں کہ بھیرے کے جنگلوں کے
درختوں کے سایہ میں بیٹھ کر بھی دینی علوم پڑھاتا رہوں گا''۔

آپ نے تفسیر ''ضیاء القرآن'' کی اشاعت کا اہتمام کیا تو آپ کے پاس روپیہ
پیسہ نہیں تھا آپ نے لاہور کے ایک تاجر غلام رسول اینڈ سنز اردو بازار لاہور کو آمادہ کیا
کہ وہ تفسیر ضیاء القرآن کو زیورِ طباعت سے آراستہ کرے ان دنوں تاج کمپنی لاہور اور
مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی بڑے بلند پایہ اشاعتی ادارے تھے۔ مگر ان اداروں نے تفسیر
''ضیاء القرآن'' چھاپنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ شاید یہ عوام میں مقبول نہ ہو سکے
غلام رسول اینڈ سنز نے پہلی جلد شائع کی۔ مگر اس کا معیار پیر صاحب کو پسند نہ آیا۔
چنانچہ ایک عرصہ کے بعد یہ تفسیر پیر صاحب نے خود چھپوانی شروع کی۔ آج اس کی
ہزاروں نہیں لاکھوں جلدیں چھپ چھپ کر ملک اور بیرون ملک پھیل رہی ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ پیر صاحب نے جب ''ضیائے حرم'' کی بنیاد رکھی تو میں ان کے
رفقائے قلم واشاعت میں تھا۔ آپ نے میرے ہی مکتبہ کے ساتھ ضیائے حرم کا دفتر
قائم کیا اور میں ابتدائی پرچوں میں مختلف قلمی ناموں سے مضامین لکھتا رہا۔ ان دنوں
پیر صاحب ماہنامہ ''ضیائے حرم'' کو خصوصی توجہ دیتے۔ محنت کرتے ایک ایک مضمون
آپ کی نگاہ سے گزرتا۔ ایک ایک سطر پر آپ محاسبہ کرتے۔ ان کی اس توجہ اور محنت کا
یہ نتیجہ ہوا کہ یہ ماہنامہ سابقہ تیس سال سے دینی صحافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور
اب تک نہایت باقاعدگی سے جاری ہے۔

جنرل صدر ضیاء الحق مرحوم نے پیر صاحب کی اہلیت اور قابلیت کو تسلیم کیا۔ قدر
افزائی کی۔ اپنے قریب کیا اور تفسیر ضیاء القرآن کے مطالعہ کے بعد آپ کو بھرپور خراج
عقیدت پیش کیا اور برملا کہا کہ ''اگر آج کے زمانے میں اہل علم وفضل کو سونے سے
تولنے کا رواج ہوتا تو میں پیر کرم شاہ ازہری کو سونے سے تولتا''۔ صدر ضیاء الحق نے
آپ کو ترازو کے پلڑے میں تو نہ بٹھایا مگر آپ کو واقعی سونے سے تول دیا۔ ملک کی
سب سے بڑی شرعی عدالت کا جج مقرر کیا اور آپ کو دینی فیصلوں میں پورا پورا اختیار
دیا۔ جو حکومتیں بدلنے کے باوجود تادم رحلت آپ کے پاس رہا۔

پیر محمد کرم شاہ ازہری خالص سنی العقیدہ، حنفی مسلک اور چشتی طریقت پر ساری
زندگی رواں دواں رہے۔ وہ معتدل مزاج کے مالک تھے۔ مذہب میں سختی، یک رخی
اور تعصب کو نہیں لاتے تھے۔ آپ کی اس اعتدالی روش کو بعض سخت گیر سنی علماء کرام نرم
گوشے والا پیر اور کچھ ''صلح کل'' کہا کرتے تھے۔ آپ کی ساری تصانیف میں اعتدال
روش نمایاں نظر آتی ہے۔ آپ نے سیاست میں بھی اعتدالی روش اختیار رکھی۔ کبھی
مزاحمت، ہڑتال، نعرہ بازی یا احتجاجی روش کو نہیں اپنایا۔

(اجالوں کا نقیب، عمران حسین چودھری، سنی فاؤنڈیشن بریڈفورڈ۔ یو کے ۱۹۹۸ء)

شیخ الحدیث حافظ محمد عالم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ

اس سال علمائے اہلسنت کا وہ کاروان جو ملک بقا کی راہوں پر چل کر ایک نئی
روحانی زندگی کا آغاز کر رہا ہے اس میں حافظ محمد عالم سیالکوٹی بھی شریک ہو کر ۲۰ اگست
۱۹۹۶ء کو راہی ملک دارالقرار ہو گئے ہیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ٥ آپ اپنی بیٹی کو
ملنے برطانیہ گئے تھے چند روز وہاں ٹھہرے، واپسی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں، جہاز کی
ٹکٹ بک تھی، سینے میں تھوڑا سا درد اٹھا، ہسپتال پہنچے، ماہر ڈاکٹروں نے اپنی زندگی بھر
کے تجربات کی روشنی میں جان بخش دوائیاں دیں مگر داعی اجل نے ہاتھ بڑھایا اور
حافظ محمد عالم صاحب نے لبیک کہتے ہوئے جان، جان آفرین کے حوالے کر دی۔

حافظ محمد عالم سیالکوٹی کی موت نے دنیائے علم وفضل کا ایک روشن چراغ گل کر
دیا۔ کاشانۂ اہلسنت وجماعت کی روشنیاں بجھ گئیں اور تعلیم وتدریس کا ایک درخشاں
آفتاب غروب ہو گیا۔ آپ کی رحلت پاکستان کے گوشے گوشے تک غم واندوہ کا سامان
لے کر آئی۔ آپ کے اہل خاندان، آپ کے شاگردان عزیز، آپ کے احباب، آپ
کے ارباب کار، آپ کے حلقۂ علم کے خوشہ چین، آپ کے سیاسی رفقاء، آپ کے
ہاری ہمنوا، آپ کے اعتقادی بادیہ پیما اور آپ کے ہزاروں آشنا دل گرفتہ اور دیدۂ تر
ہو کر رہ گئے۔

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

حافظ محمد عالم مرحوم کے جنازے پر جتنے علمائے کرام شریک ہوئے شاید ہی کسی
جنازے پر آئے ہوں۔ حافظ محمد عالم کے غم میں جتنی آنکھیں اشکبار ہوئیں شاید ہی کسی

مرنے والے پر ہوئی ہوں۔ حافظ محمد عالم کی رحلت پر جس قدر غم ورنج کا اظہار کیا گیا
شاید ہی کسی کے حصے میں آیا ہو۔ وہ سیالکوٹ ہی نہیں سارے پاکستان کو اداس کر
گئے۔ سارے سینوں کو غمگین بنا گئے۔ سارے شہر علم وفضل کو ویران کر گئے۔

ع ''اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا''

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے دامن رحمت سے ڈھانپے اور انہیں جوار رحمت میں ایسی
جگہ ملے جہاں مغفرت کے دریا بہتے ہیں۔

حافظ محمد عالم مرحوم ۱۹۲۷ء میں ریاست جموں وکشمیر میں جموں شہر سے تقریباً
بیس میل دور ایک چھوٹے سے گاؤں ''سکہ'' میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی حاجی
شاہ محمد تھا۔ اور ریاست جموں وکشمیر کے گوجر خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ نے
زندگی کے ابتدائی سالوں میں سیالکوٹ آ کر قرآن مجید حفظ کیا۔ سیالکوٹ کے محلہ
''میانہ پورہ'' میں آپ کے پھوپھا تدریس قرآن کا ایک مدرسہ قائم کیے ہوئے تھے۔
یہاں سے حافظ محمد عالم مرحوم نے قرآن پاک کو اپنے سینے میں سمیٹا۔ ان دنوں
ریاست جموں کے دیہات میں لاہور کے ایک عالم اجل حضرت مولانا محمد نبی بخش
حلوائی (مولف تفسیر نبوی) اعتقادی تربیت کے لیے دور دراز علاقوں میں جایا کرتے
تھے۔ اعتقادی اصلاح کے ساتھ ساتھ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ سلسلہ نقشبندیہ
مجددیہ بہ فیضان حضرت پیر جماعت علی شاہ لاثانی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تربیت بھی دیا کرتے
تھے۔ اس خطہ میں آپ کے ہزاروں مرید مختلف دیہاتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ حافظ
محمد عالم قبلہ بھی مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہوئے۔ مولانا نے اس ذہین
حافظ بچے کو اٹھایا اور لاہور لے آئے اور اعلان کیا کہ اسے ''عالم دین'' بنانا ہے۔

حافظ محمد عالم مرحوم لاہور پہنچے تو دہلی دروازے کے باہر سنّی کوتوالی کے ساتھ جامع
مسجد کے مدرسہ میں داخل ہو گئے اور صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھنے لگے۔ یہ ایک
مختصر سا تدریسی ادارہ تھا جس میں ذہین بچے دینی علوم کی ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔

حافظ محمد عالم کے ابتدائی اسباق کے شریک درس چند ایسے طلبہ بھی تھے جو آگے جا کر
اپنے اپنے مقام پر بڑے معروف ہوئے۔ ان میں صاحبزادہ محمد اسلم ابن سید علی اکبر
شاہ علی پوری، صوفی غلام حسین گوجروی (مرید صاحبزادہ سید علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ)
اور پیرزادہ اقبال احمد فاروقی شامل ہیں۔ ان طلبہ کو ''مرکزی دارالعلوم انجمن حزب الاحناف
لاہور'' کے ایک قابل استاد حضرت مولانا مہر دین رحمۃ اللہ علیہ خصوصی طور پر پڑھانے آتے
تھے۔ ابتدائی کتابوں سے ابھرے تو حافظ محمد عالم دارالعلوم حزب الاحناف اندرون
دہلی دروازہ کے باقاعدہ طالب علم بن گئے۔ وہ سارا دن پڑھتے اور شام کو اپنے استاد و
مرشد مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں آ جاتے۔

حافظ محمد عالم مرحوم کی ذہنی اٹھان اتنی تیز تھی کہ وہ دینی مدارس کی سست روی کی
ہمنوائی کرنے سے قاصر تھی۔ وہ تعلیم کے لیے تڑپتے، تیز رو بن کر کتابیں پڑھنے کے
لیے بے چین رہتے مگر تدریسی حلقوں کی پابندی انہیں آگے بڑھنے نہ دیتی۔ ان کا ایک ہم
سبق (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی - راقم) تعلیم وتدریس کی تلاش میں ریاست بہاولپور
کے ایک دینی مدرسے میں جا پہنچا تھا۔ جہاں اساتذہ تازہ جذبے سے پڑھاتے تھے۔
پیرزادہ اقبال احمد فاروقی نے لاہور آ کر بہاولپور کے تیز رفتار اساتذہ کی تعریف کی تو
حافظ محمد عالم مرحوم کسی کو بتائے بغیر ''زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت'' کہتے ہوئے
ریاست بہاولپور جا پہنچے۔ تدریس کا آغاز ہوا، کئی ماہ پڑھتے رہے مگر یہاں کے اساتذہ
بھی ان کی ذہنی تیزی کی ہمنوائی نہ کر سکے۔ آپ نے وہاں سے رخت سفر باندھا،
نواب آف ممدوٹ کی ریاست جلال آباد میں ایک عالم دین مولانا محمد علم الدین مرحوم
کے دینی درس میں آ بیٹھے مگر ایک ماہ کے بعد یہاں سے بھی اپنے دل ناصبور کے
ہاتھوں تنگ آ کر واپس لاہور آ گئے اور اپنے استاد مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے
مدرسہ میں دوبارہ داخل ہو گئے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: ''حافظ محمد عالم!
میں تجھے (عالم دین) بنانا چاہتا ہوں اور تم بہاولپور کے ریگستانوں میں مارے مارے

پھرتے ہو''۔

اب حافظ محمد عالم دار العلوم حزب الاحناف، دار العلوم نعمانیہ اور مدرسہ
کے اساتذہ سے کتابیں پڑھنے لگے۔

''دانہ می چیدیم ہر جائے کہ خرمن یافتیم!''

آپ نے چند سالوں میں نہ صرف دینی علوم کی متداول کتابوں پر دسترس حاصل کرلی بلکہ منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات میں بھی کامیابیاں حاصل کرلیں۔ آپ دار العلوم حزب الاحناف سے دستار فضیلت لے کر نکلے تو مختلف مدارس میں استاد بن کر مسند تدریس پر آبیٹھے۔ حزب الاحناف اور نعمانیہ کے علاوہ آپ نے دار العلوم جامعہ نعیمیہ چوک دالگراں لاہور کے اساتذہ کی اس ٹیم میں حصہ لیا جسے مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے منتخب کیا تھا۔ یہاں حافظ محمد عالم مرحوم نے دو سال پڑھایا اکبری دروازے کے اندر ایک مسجد کی امامت سنبھالی۔ شاہ محمد غوث کی جامع مسجد میں خطابت کا آغاز کیا۔ اور مسلم ماڈل ہائی سکول کے عربی استاد مقرر کر دیئے گئے۔

زندگی کے اس موڑ پر حافظ محمد عالم مرحوم نے اپنے شہر سیالکوٹ پر نگاہ ڈالی ایک عالم دین، ایک مفتی مدرس، ایک پختہ عقیدہ رکھنے والے سنی کی ضرورت تھی۔ آپ کا گھر سیالکوٹ میں تھا۔ آپ کے قبیلے کے ہزاروں لوگ سیالکوٹ کے ارد گرد دیہات میں آباد تھے۔ جموں و کشمیر سے ہجرت کر کے آنے والے بے پناہ لوگ سیالکوٹ میں آبسے تھے۔ حافظ محمد عالم مرحوم نے لاہور کی علمی مصروفیتوں اور رونقوں کو خیر باد کہتے ہوئے شہر سیالکوٹ کے دل میں دو دروازہ کی جامع مسجد کو اپنا مرکز بنا لیا۔ حافظ محمد عالم کے سیالکوٹ میں آنے کے بعد دو دروازہ کی مسجد تدریس علوم اسلامیہ اور حفظ قرآن کا مرکز بن گئی۔ طالب علموں کے قافلے یہاں آنے لگے۔ حفظ کے علاوہ دینی کتابیں پڑھنے والے طلبہ کے جمگھٹے لگ گئے۔ سیالکوٹ کے کوچہ و بازار اس بات کی شہادت دیں گے کہ حافظ محمد عالم نے شبانہ روز درس و تدریس کا وہ کام کیا جس کی

مثال نہیں ملتی۔ آج سیکڑوں نہیں ہزاروں ایسے نوجوان علمائے کرام اور حافظ موجود ہیں جو حافظ محمد عالم کے شاگرد رہے ہیں۔

حافظ محمد عالم نے ایک مدرس کی حیثیت سے دن رات کام کیا۔ مگر وہ سیالکوٹ کی دینی مجالس میں بھی صف اول کے خطیب نظر آئے۔ دینی قیادت کی صف اول میں دکھائی دیئے اسلامی تقریبات میں وہ ہمیشہ نمایاں نظر آئے۔ مرنے جینے کے موقع پر وہ ہر حالت میں شریک ہوتے۔ وہ جدھر جاتے ان کے شاگردوں کا حلقہ ان کے ساتھ ہوتا۔ اور سیالکوٹ شہر کے اکثر دکانداروں اور صنعت کاروں میں کوئی نہ کوئی فرد ان کا شاگرد ہوتا۔

حافظ محمد عالم مرحوم نے سیاست میں قدم رکھا تو انہیں ''جمعیت علماء پاکستان'' کی قیادت پسند آئی۔ وہ میدان انتخاب میں نکلے تو جمعیت العلماء پاکستان نے انہیں ٹکٹ دیا تو سیالکوٹ کے شہریوں نے انہیں ووٹ بھی دیئے اور نوٹ بھی۔ پھر محبت اور پیار سے ان کے ساتھ رہے۔ جب آپ پی این اے کی تحریک میں آگے بڑھے تو انہیں قید و بند کی منزلیں بھی طے کرنا پڑیں۔ ان پر کئی مقدمات بنائے گئے۔ کئی گرفتاریاں ہوئیں، کئی چھاپے پڑے۔ مگر وہ ہر ابتلا میں کامیاب نکلے۔ ہر امتحان میں کامران رہے۔

وہ ملک بھر کی دینی تقریبات میں ہمیشہ نمایاں نظر آتے۔ وہ اہلسنت و جماعت کی ہر آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے بیٹے حافظ محمد رضا نے جب آزاد کشمیر کے انتخابات میں حصہ لیا تو حافظ محمد عالم مرحوم کا علمی اور سیاسی اثر نمایاں نظر آیا اور آپ کا بیٹا ایم ایل اے ہوگیا۔ حافظ محمد عالم ایسے خوش قسمت عالم دین تھے جن کے سارے بیٹے اور بیٹیاں حافظان قرآن ہیں۔ ان کے داماد عالمان دین ہیں۔ ان کے بیٹے ان کے علمی جانشین ہیں۔

آپ ابتدائی طور پر حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد رشید اور مرید صادق تھے۔[۱۲] اس طرح آپ سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے وابستہ رہے۔ پہلے پیر و مرشد

کی رحلت کے بعد پیر قندھاری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ آپ کتابی علمی
باوجود سلوک و روحانیت کی منازل طے کرنے لگے۔ انہیں جہاں علمائے مصر
حیثیت دی وہاں وقت کے مشائخ نے آپ کو بڑی عزت دی۔ آپ
سے عقیدت رکھتے تھے۔ وہ پیر محمد شفیع قادری آف ڈھوڈا شریف (
مند تھے۔ وہ حضرت پیر کرم شاہ بھیرہ شریف کی علمی رفاقت سے
مقبول تھے۔

آج ہم اپنے دوست حافظ محمد عالم مرحوم کی رحلت پر اظہار غم کر
کے علمی اور تدریسی کارناموں کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔
شاگردوں اور ان کی فاضل اولاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ مرحوم کے علمی
مقامات پر ایک مکمل کتاب مرتب کریں۔ ایسے عالم دین کو جو ذرہ بن کر
پہاڑیوں سے آیا اور آفتاب بن کر پاکستان کے دینی اور علمی آسمان پر چمکا،
دینا بڑی زیادتی ہے۔ علمی حلقوں میں ایک جملہ بڑا مشہور ہے۔

''موت العالِم موت العالَم''

ایک عالم کی موت ایک جہان کی موت ہوتی ہے۔ اس جملے کی روشنی میں
یہ کہنے کی اجازت دیں کہ موت العالم، موت العالَم اور موت العالِم موت العالَم
حافظ محمد عالم کی موت ایک عالم دین کی موت ہے اور ایسے عالم کی موت
کی موت ہوتی ہے!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

(''جہانِ رضا'' ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۹ء)

بھاٹی دروازہ — لاہور کا علمی خیابان

ایک قدیم شہر ہے۔ وہ دریائے راوی کے کنارے پر آباد ہونے کی وجہ
وادی میں اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ شہنشاہ ہند جلال الدین محمد اکبر
شہر بنا دیا تھا اور اس میں ایک قلعہ تیار کیا جو ہندوستان کی دفاعی
کرتا تھا۔ قلعہ کی تعمیر کے وقت جب اس کا ملبہ جمع کیا گیا تو ایک بلند ٹیبہ
بعد میں ''ٹبی'' کا نام دیا جانے لگا۔ ٹبی کا یہ علاقہ لاہور سے اونچا تھا اور
سے لے کر مستی دروازہ اور ٹکسالی دروازہ کے درمیان بلند سطح پر لاہور
محلات اور مکانات بننے لگے اور ان محلات پر اعیانِ مملکت کے علاوہ اہلِ
لگے۔ قلعہ اور بادشاہی مسجد کے دامن میں یہ علاقہ سارے لاہور کا سول
وی-آئی-پی لوگوں کے مکانات تھے۔ بھاٹی دروازہ کا نام اصل میں
تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں مغلوں کی سلطنت سے پہلے بھٹی قوم کے
نے فتح ملتان کے بعد لاہور کے دامن میں آکر پڑاؤ ڈالا اور یہاں ہی آباد
زمانہ سے بگڑتے بگڑتے بھٹی دروازہ ''بھاٹی دروازہ'' بن گیا۔
دروازہ کے اندر داخل ہوں تو کچھ دور چل کر بائیں طرف ایک کوچہ ہے
'' کہتے ہیں۔ آج سے کوئی سو برس پہلے اسی کوچے کے ایک مکان
مولوی محمد شفیع جیسے نامور ماہر السنہ شرقیہ کے استاد مولوی اصغر علی روحی رہتے
یہاں ان کی مسجد روحی موجود ہے) مولانا روحی مجمع کمالات تھے اور
و رشد۔ ان کے درس کلام مجید کا شہرہ دور دور تھا، بعد میں انہوں نے
بھی قرآن مجید کے درس کا سلسلہ شروع کیا۔ بڑے پاک باطن اور فرشتہ

صورت انسان تھے اور ان لوگوں میں سے تھے جن کی صورت دیکھ کر
نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ لاہور شہر کے اکثر اہل علم و فضل آپ
میں آتے۔ خصوصاً آپ علمائے اہلِ سنت کے حلقہ میں ایک گل
نظر آتے۔ وہ کٹھالہ (گجرات) سے چل کر لاہور آئے اور شہر کے
میں بڑے مقبول ہوئے۔ پچاس سال تک اسلامیہ کالج کے پروفیسر
ادبی کتابیں تصنیف کیں جن میں ''العروض والقوافی''، دبیر عجم، ''مانی
مشہور ہوئیں، آپ کے دو بیٹے مولانا صوفی محمد ضیاء الحق اور محمد بہاء الحق
فارسی کے نامور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ آپ ۱۹۵۴ء میں فوت ہوئے
وطن گجرات کٹھالہ میں دفن ہوئے۔

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع:

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع جو بعد میں اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مقرر
طالب علمی کے زمانے میں اور اس زمانے میں جب تک ان کا تعلق
سے رہا، اسی کوچے کے قریب ایک مکان میں رہتے تھے اور ان کے
مطابق انہوں نے مولانا روحی کی شاگردی کے فیضِ صحبت ہی سے عربی اور
علوم میں وہ دستگاہ حاصل کی جو آگے چل کر ان کی ناموری کا باعث ہوئی
بدولت انہوں نے ان دونوں زبانوں کی مشہور کتابوں اور دستاویزوں کے
کاوش اور کوشش سے ریسرچ کی۔ ان کی تصانیف میں سے ''فہارس
عبدربہ'' جوان کی پندرہ سال کی محنت کا نتیجہ ہے اور چودہ سو صفحات پر
یونیورسٹی نے دو جلدوں میں شائع کی۔ مولوی محمد شفیع کے اہم علمی کارنامے
دستاویزات کی فہرست اتنی طویل ہے اور ان کے مندرجات اس قدر
ہیں کہ اس مضمون میں ان کے بیان کی گنجائش نہیں۔ یہاں تو ان کے ذکر
مدعا ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی بھاٹی دروازے کے اندر اس علمی اور ادبی

مضمون کا موضوع ہے۔ آپ کے کتب خانہ میں سید ابوالحسن علی الہجویری
حضرت داتا گنج بخش کی تصوف پر مشہور کتاب ''کشف المحجوب'' کا ایک
قدر نسخہ تھا جسے ان کے بیٹے احمد ربانی نے، جو ریلوے میں آفیسر تھے،

کالج لاہور کے پرانے استادوں میں چار پانچ ایسے بزرگ ہیں جن کا
وقت بھی لوگ عزت و احترام سے لیتے تھے اور جن کی یاد سے آج بھی اس
نقوش ابھر آتے ہیں جو اس زمانہ کے استادوں کے علمی تصرفات کا خراج
تھا۔ اسے حسنِ اتفاق کہئے یا بھاٹی دروازے کی خوبی تقدیر کہ یہ سب لوگ
ے ہی کے اندر رہتے تھے اور شاید اس لیے کہ یہ علاقہ اورینٹل کالج سے
قریب تھا۔
کالج اپنے ابتدائی زمانہ میں بھاٹی دروازے کے اندر راجہ دھیان سنگھ کی
واقع تھا۔ اگر میں ان صاحبانِ علم و فضل کے کمالات گنوانے بیٹھوں تو ان
ایک ایک بزرگ کے فضائل کی تفصیل کے لیے دفتر چاہئیں۔
یہاں اگر اورینٹل کالج کی مختصر سی تاریخ بیان ہو جائے تو مناسب ہے۔ انگریزی
کے ابتدائی زمانے میں لاہور میں علومِ مشرقیہ کی ترویج کے مقصد کو پیشِ نظر
انجمن قائم کی گئی تھی جس کا نام ''انجمن پنجاب'' تھا۔ اس کی داغ بیل ۲۱
۱۸۶۵ء کو لاہور میں ڈالی گئی تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر اس انجمن کے روحِ رواں تھے۔
کی سرپرستی اور ڈاکٹر لائٹنر کی رہنمائی میں اسی سال 'مجلسِ علومِ شرقیہ' کی
کی اور اسی جگہ جہاں لاہور سکھشا سبھا نے ''۱۸۶۳ء میں ہیرا منڈی کے قریب
شالہ قائم کیا تھا اور جس میں محض ہندی اور سنسکرت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہ
قائم ہوا اور انجمن پنجاب نے اس پاٹھ شالہ کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس کے
میں اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم کا اضافہ کر دیا۔ یہ وہی مقام ہے جہاں آج کل

ہیرا منڈی میں حضرت پیر نوگزہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے سامنے لاہور کارپوریشن کا ہسپتال واقع ہے۔ اسی مکان کے مقابل راجہ دھیان سنگھ کی حویلی ہے جہاں گورنمنٹ کالج لاہور پہلے پہل قائم ہوا تھا۔

مارچ ۱۸۷۲ء تک علوم السنہ شرقیہ کا یہ ادارہ اورینٹل سکول کہلاتا تھا۔ اس کے بعد اس کا نام اورینٹل کالج رکھ دیا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد اورینٹل کالج کے لیے راجہ کھڑک سنگھ کی حویلی حاصل کر لی گئی۔ یہ حویلی لوہاری دروازے کے اندر نہال چند کے مندر کے سامنے واقع تھی۔ ۱۸۷۳ء میں اورینٹل کالج انارکلی میں کرائے کی ایک عمارت میں منتقل ہو گیا۔ ۱۸۷۶ء میں جب گورنمنٹ کالج کی عمارت مکمل ہو گئی تو اس کے لیے اس عمارت کا شمال مشرقی گوشہ مقرر ہوا اور ڈاکٹر لائٹنر اس کے پہلے پرنسپل نامزد کیے گئے۔ اس وقت مولوی فیض الحسن سہارنپوری صدر مدرس عربی تھے اور مولوی عبدالحکیم کلانوری صدر مدرس فارسی، یہ دونوں بزرگ بھاٹی دروازے ہی میں رہتے تھے۔ جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس زمانے میں مفتی محمد عبداللہ ٹونکی صدر مدرس عربی تھے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی بازار حکیماں میں مستری حاجی محمد کے مکان میں رہتے تھے جہاں سے چند قدم آگے ''انجمن نعمانیہ'' کا دارالعلوم نعمانیہ، عربی، فارسی اور دینی علوم کا بے مثال ادارہ ہے۔

علامہ اقبال کی رہائش گاہ:

کوچہ چٹرنگاں سے کچھ آگے چلیں تو ایک گلی آتی ہے جو نائیوں کی گلی کہلاتی ہے۔ اس کوچے سے ذرا آگے چل کر دائیں طرف کو ایک کوچہ ہے جسے محلہ جلوٹیاں کہتے ہیں۔ اس کے بالمقابل وہ مکان ہے جہاں سر محمد اقبال رہتے تھے۔ وہ سیالکوٹ سے لاہور آئے تو کئی برس تک یہیں رہے۔ یہ وہی محلہ ہے جس کی ایک گلی کوچہ مجاوراں میں ہے، جہاں پیر شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش تھی۔ اس سے ذرا آگے چلیں تو ایک اور محلہ آتا ہے جسے ''چومحلہ'' کہتے ہیں۔ اس میں اونچی مسجد کے خطیب مولوی عالم دین

مترجم ''مکتوباتِ مجدد الف ثانی'' رہتے تھے جو اپنے علم و فضل کے باعث بہت مشہور ہے۔ یہ مسجد دراصل حضرت بلھے شاہ کے پیر و مرشد شاہ عنایت قادری رحمۃ اللہ علیہ نے بنائی تھی اور آپ نے اسے روحانیت کا مرکز بنا دیا۔ اس مسجد کے سامنے کوچہ شاہ عنایت قادری ہے۔ اس مسجد میں بڑے بڑے علماء خطیب کی حیثیت سے آئے۔ مولانا غلام قادر بھیروی جیسے معروف عالمِ دین خطیب رہے۔ آج کل مولوی محمد مظفر اقبال رضوی خطیب ہیں جو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے شاگردِ رشید اور خلیفہ مجاز مفتی غلام جان ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند ہیں۔

اسی محلے میں مولانا غلام مرشد خطیب مسجد شاہی رہتے تھے۔ وہ ایک عرصہ تک دارالعلوم نعمانیہ میں مدرس رہے۔ معارف دین اور عربی ادب پر جن کی آگاہی کی تعریف اقبال کی زبان سے بھی سنی گئی ہے اور جن کا درس قرآن مجید ایک عرصہ تک مرجع راہروانِ راہِ ہدیٰ رہا ہے۔ اس سے کچھ دور آگے بازار کے بائیں طرف نور محلہ واقع ہے اور دائیں طرف ''محلہ شیش محل'' ہے۔ یہی وہ محل ہے جسے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پردادا حافظ شاہ کاظم علی خاں مرحوم نے بنایا تھا جو مغل عہد میں فوج کے ایک لشکر کے کمانڈر تھے۔ یہ مغل اقتدار کے آخرین سپہ سالاروں میں سے تھے۔ سکھ دور میں ''شیش محل'' پر سکھوں نے قبضہ کر کے اس کے علمی اور عسکری نوادرات تباہ کر دیئے تھے۔

''شیش محل'' سے آگے چل کر رائے بہادر میلہ رام کی حویلی تھی جس کا دستبرد زمانہ سے اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا بلکہ خود رائے بہادر میلہ رام اور ان کے بعد ان کے بیٹے رائے بہادر رام سرن داس کی شخصیت ایسی تھی کہ اس علاقے کے لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ یہ ہندو نہیں تھے بلکہ سناتن دھرم کے پیروکار تھے اور پرانی وضع کے رئیس۔ خود ادیب نہ تھے مگر ادیبوں اور شاعروں کے سرپرست تھے۔ ۱۸۸۰ء میں جب امرتسر سے لاہور تک ریل چلی اور لاہور کا اسٹیشن تعمیر ہوا تو لنڈا بازار والے یہاں

سلطان موچی دروازے والے میاں محمد بخش دال گر اور رائے بہادر میلہ رام کی
ٹھیکیداری میں یہ کام سرانجام پایا۔ رائے بہادر میلہ رام اور رائے بہادر رام
جب تک زندہ رہے ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے تہوار بڑی شان سے منائے
ہر تہوار پر اپنی لال کوٹھی میں جو بھاٹی دروازہ کے باہر واقع ہے۔ محفل رقص
سجاتے اور اپنے تمام احباب بلاتفریق مذہب وملت بلا کر اس کی رونق بڑھاتے
اقبال، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین، میاں سراج الدین، راجہ نریندر ناتھ،
کشن کول، نواب زادہ لیاقت علی خان، نواب احمد یار خان دولتانہ،
خان، میاں محمد نصیر الدین خان، خان بہادر سید مراتب علی، سردار سندر
سردار جوگندر سنگھ اکثر ان محفلوں میں گھل مل کر بیٹھتے تھے۔ یہی وہ کوٹھی ہے
سنیوں کا مشہور ''مرکزی دار العلوم حزب الاحناف'' ہے جسے علامہ سید ابو البرکات
احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے خرید کر علم وفضل کا مرکز بنا دیا اور دہلی دروازہ کے
دار العلوم کو یہاں لا کر مسند تدریس بچھا دی۔

بھاٹی دروازے کے اندر ایک کوچہ ہے جسے ''موتی مبہ'' کہتے ہیں۔ اس
میں سر عبدالقادر رہتے تھے جن کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اورینٹل کالج کے
کے سربراہ اور سنیوں کے بلند پایہ عالم دین مولانا عبدالحکیم کلانوری بھی
تھے۔ اس محلے سے کچھ دور آگے جا کر یہ بازار جوگی محلے کو جا نکلتا ہے۔ مسٹر
بیرسٹر ایٹ لاء، جو جرنیل میراں بخش کے نام سے معروف تھے، انگلستان جانے
پہلے اسی محلے میں رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں ایک مشہور
بیرسٹر ٹیگین اور اس کے بعد ایک اور انگریز بیرسٹر مسٹر رینالڈز کے ساتھ کام کیا
رینالڈز اس مشہور و معروف افسانہ نگار جارج ڈبلیو ایم رینالڈز کے بیٹے تھے
''مسٹریز آف دی کورٹ آف لنڈن'' لکھ کر بڑی شہرت حاصل کی تھی۔ اسی
اس زمانے میں منشی طاہر الدین بھی رہتے تھے۔ یہ اپنے ابتدائی زمانے میں میاں

ایٹ لاء کے منشی تھے اور قانونی رموز سے خوب واقف۔ جب میاں سر محمد
ہند کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہو کر دہلی چلے گئے تو انہی منشی طاہر الدین
سے ڈاکٹر سر محمد اقبال انارکلی میں اسی مکان میں چلے آئے جس میں سر محمد
کیا کرتے تھے۔ سر محمد شفیع اپنے باقی ماندہ مقدمات کی پیروی کا کام سر محمد
گئے تھے اس لیے منشی طاہر الدین اس کام میں ان کے بہت ممد و معاون
بعد میں انہوں نے اقبال کے دل میں اپنی بے لوث خدمت سے ایسا
کر لیا کہ انہوں نے اپنی وصیت میں اپنے دو اور دوستوں کے ساتھ ان کو بھی
اور جائیداد کا ولی مقرر کیا۔ اس محلے میں ایک اور مکان ہے جس میں محمد طفیل
صاحبزادے رہتے تھے۔ ان کو خوش نویسی کا بڑا شوق تھا۔ ان کا ذکر اس لیے
ہے کہ آگے چل کر انہوں نے اسی محلے سے ''نقوش'' کے نام سے اردو کا ایک
کئی لحاظ سے لاثانی مجلہ شائع کرنا شروع کیا جو پہلے ایبک روڈ، اب اردو
سے شائع ہوتا ہے۔ یہ رسالہ اپنی ضخامت، مضامین کے تنوع اور کتابت
کے اعتبار سے اپنے تمام پیش رو رسالوں سے مختلف اور ایک منفرد حیثیت
اور اس کے بعض شمارے تو ایسے ہیں کہ زمانہ مستقبل میں ایک تاریخی مقام
کریں گے اور ان مصنفین کے لیے بہت مفید ثابت ہوں گے جنہیں موجودہ اردو
تاریخ مرتب کرنے میں حوالوں کی تلاش ہو۔ ''نقوش'' نے مختلف نمبر نکالے،
لاہور نمبر، رسول نمبر اور قرآن نمبر اتنے اہم ہیں کہ دینی حلقوں میں اپنے
کو منوا لیا۔

آگے چل کر شیخ سید ولی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار مبارک کے پہلو میں محلہ کاغذیاں واقع
میں میر ناظر حسین ناظم شروع شروع میں رہتے تھے، وہ بعد میں کوچہ فقیر خانہ
بازار میں واقعہ ہے، رہنے لگے۔ میر ناظر حسین ناظم بھاٹی دروازے کے
انجمن نعمانیہ کے سالانہ جلسوں میں اپنی نظمیں سناتے اور اہل علم و سخن

سے داد پاتے تھے۔

محلہ کاغذیاں کے بالمقابل لال حویلی کا کوچہ ہے جس میں سکھوں کی
کے زمانے میں فقیر سید نورالدین اور فقیر شمس الدین رہتے تھے۔ ان کی وفات
یہ حویلی دو حصوں میں منقسم ہوگئی۔ ایک حصے میں فقیر سید قمرالدین اور دوسرے
فقیر سید شہاب الدین رہنے لگے۔ آگے چل کر ''کوچہ دربار صاحب'' آ
میں ایک مسجد اور اس سے ملحق ایک مکان واقع ہے جسمیں وہ تبرکات عالیہ
ہیں جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مشیر فقیر سید عزیزالدین نے شاہ شجاع الملک
کیے تھے۔ یہاں دن رات قرآن مجید کی تلاوت ہوا کرتی تھی۔ اسی مکان
حافظ محمد حفیظ رہتے تھے جو اپنے زمانے میں قرات کے ماہر تھے اور جن کے درس
کا فیض عام تھا۔

اسی کوچے کے قریب پہلوانوں کا کوچہ واقع ہے جہاں پنجاب کے ایک
پہلوان محمد حسین جو ''حسا پہلوان'' کے عرف عام سے مشہور تھے، رہتے تھے۔ ان کے
بیٹے وہ حسن محمد حیات ہیں جو بعد میں سیاستِ ہند میں مولانا محمد علی جوہر
راست تھے اور اس کے بعد ریاست بھوپال میں لیجسلیٹو کونسل کے سیکرٹری
ان کی جوانی انہیں گلیوں میں گزری ہے۔ کوچہ دربار صاحب بازار حکیماں
ہے۔ اس بازار میں چار مکان بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ حکیم حسام الدین کا مکان
کے بیٹے حکیم امین الدین تھے جو ان مسلمان طلبہ میں سے تھے جو پہلے پہل
گئے اور جنہوں نے قانونی سند لے کر وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ یہی وہ مکان
میں ۱۸۹۵ء میں حکیم شجاع الدین کی سرپرستی میں ایک اردو بزم مشاعرہ قائم ہوئی
جس کے دوسرے مشاعرے میں اقبال نے جو اس زمانے میں گورنمنٹ کالج
پڑھتے تھے، اپنی اردو غزل پڑھی۔ حکیم حسام الدین لاہور اور امرتسر دونوں جگہ
کے فرائض انجام دیتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں لاہور کا بازار حکیماں

[...] کا کوچہ حکیماں انہیں کے دم قدم سے آباد تھا۔ یہ مہاراجہ کشمیر کے طبیب خاص
کے علاوہ ریاست ہائے پھلکیاں کے ہر والی ریاست کے طبی مشیر بھی تھے اور
[...] مرض اور حذاقت کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کی خداپرستی اور
[...] کاری کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوا سے زیادہ ان کی دعا کے طالب نظر آتے تھے۔ وہ
[...] بیماروں کو دوا کے بجائے دم کر کے تندرست کر دیتے تھے۔

اس کے بالمقابل میرے دوسرے عم زاد بھائی حکیم شہباز دین کا مکان تھا۔ یہ
[...] لاہور کی ادبی زندگی میں بڑی نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی بیٹھک میں ۱۸۹۵ء
[...] ۱۹۲۱ء تک جب تک حکیم شہباز دین زندہ رہے، ہر روز شام کو لاہور کے ادیبوں،
[...] عالموں اور سیاست دانوں کا ایک جمگھٹا رہتا تھا۔ موجودہ زمانے کی
اصطلاح کے مطابق یہ ایک قسم کا لٹریری کلب تھا۔ اس میں جو لوگ باقاعدہ ہر شام کو جمع
ہوا کرتے تھے، ان میں مولوی احمد دین، شیخ گلاب دین، مفتی محمد عبداللہ ٹونکی، مولانا محمد
دین جالندھری، مولوی اصغر علی روحی، سید محمد شاہ وکیل، سر عبدالقادر، سر شہاب الدین،
محمد اقبال، خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش، خواجہ امیر بخش، خلیفہ نظام الدین اور
[...] مولا بخش کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ اسی محفل احباب میں کبھی کبھی سر محمد
[...]ین، سر محمد شفیع، فقیر سید افتخار الدین اور مرزا سلطان احمد بھی آ بیٹھتے تھے۔

انجمن حمایت اسلام کے بانیوں اور اربابِ نظم و نسق میں حاجی شمس الدین، خواجہ
[...] پروفیسر مولوی حاکم دین نقشبندی اور خلیفہ حمید الدین بھی اس بزمِ احباب میں
[...] مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کی گتھیاں سلجھاتے تھے۔

اس سے آگے چل کر ''آستانہ شریف'' کا کوچہ آتا ہے جس میں فقیر سید جمال
الدین کی تعمیر کی ہوئی لال مسجد واقع ہے اور اسی کی بغل کے ساتھ ایک چھوٹا سا
قبرستان ہے جس میں فقیر خاندان کے جدامجد فقیر سید غلام محی الدین کا مزار ہے جو
[...] ثانی'' کے لقب سے ملقب تھے۔ اسی احاطے میں سکھ دور کے معتمد و اہلِ علم فقیر

سید عزیز الدین، فقیر سید امام الدین، فقیر سید نور الدین اور فقیر سید شمس الدین
بھی ہیں۔ اسی کوچے میں سر سید مراتب علی شاہ کی اہلیہ محترمہ سیدہ مبارک
بارہ ہے اور ان کے والد فقیر سید افتخار الدین کی جدی حویلی بھی۔ اسی حویلی
فقیر سید امام الدین کی حویلی ہے جو سکھوں کے زمانے میں قلعہ گوبند گڑھ
صوبیدار اور شاہی خزانے کے محافظ تھے۔ اس کے سامنے فقیر سید حفیظ الدین
میں مرزا عظیم بیگ ایک پرانی وضع کے رئیس رہتے تھے۔ ان کے بیٹے مرزا اعظم
شعر و شاعری کا شوق وافر تھا اور وہ مرزا ناظر حسین ناظم کے تلامذہ میں ایک
رکھتے تھے۔ باپ کی وفات کے بعد اس قدر زیادہ دولت ان کے ہاتھ آئی کہ وہ
مشہور ہو گئے۔ اس لوٹ میں ان کے ذوقِ سخن کو بھی کافی مالِ غنیمت ملا۔ انہوں
اپنی حویلی میں ایک محفلِ مشاعرہ قائم کی جس کے میر مشاعرہ ان کے استاد میر ناظر
حسین ناظم تھے۔ اس بزم میں زیادہ تر موصوف کے شاگرد ہی اپنا کلام
اپنے استاد سے دادِ سخن پاتے۔ اس بزم مشاعرہ کے سیکرٹری فقیر سید امام الدین کے
پوتے فقیر سید سعید الدین تھے جو میر ناظر حسین ناظم ہی کے شاگرد تھے اور بہت اچھا
شعر کہتے تھے اور اسی کوچے میں اپنے دادا کی حویلی میں رہتے تھے۔ فقیروں کا
خاندان طبیبوں اور حکیموں کا خاندان تھا جو سکھوں کے شاہی خاندان کے معالج تھے
ان کو وزیر اور مشیر کا درجہ حاصل تھا۔ ان کی اس حویلی میں سید مراتب علی شاہ نے اب
ایک خوش نویسی کا سنٹر قائم کر دیا ہے اور تبرکات کا عجائب گھر بھی ہے۔

شاید اس ناقدری کے زمانے میں یہ بیان کر دینا موجب تعجب ہو کہ مرزا اعظم
بیگ نے اپنے استاد میر ناظر حسین ناظم کے دولت کدے کو حقیقت میں دولت کدہ بنا
دیا تھا۔ مرزا اسلم بیگ کی وفات کے ساتھ ہی اس محفل کا چراغ بھی گل ہو گیا۔ یہاں
یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اقبال اور ان بزرگوں کی محفل جن کے نام اوپر گنوائے گئے
ہیں۔ بازار حکیماں میں حکیم شہباز دین ہی کی بیٹھک میں جمتی تھی اور اس محفل کا رنگ

اعظم بیگ کی بزم مشاعرہ سے کچھ الگ تھا۔ وہاں زیادہ تر ادبی و قومی مسائل کا
اور اس محفل میں وہی کاکل و رخسار کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس کوچے کے
حکیم عبداللہ انصاری کی بنائی ہوئی مسجد واقع ہے جس کی تعمیر کی تاریخ اس
نکلتی ہے۔

کرد با صدق ایں عبادت گاہ عبداللہ حکیم

انہوں نے بازار حکیماں کی بنیاد ڈالی تھی اور اپنا گھر بنانے سے پہلے اللہ کا گھر بنایا
اس مسجد میں ایک عرصہ تک مولانا غلام محی الدین بگوی درس دیا کرتے تھے جہاں
مولانا غلام قادری بھیروی نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی بگوی خاندان کے
کرام نے ایک طویل عرصہ تک شاہی مسجد کی خطابت کی۔ اس کے سامنے ہی حکیم
کی حویلی تھی جس کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں مگر اس کے کھنڈرات میں ان
باقی ہے۔ یہ اپنے زمانے میں بہت بڑے طبیب تھے اور اپنے تمول اور فیاضی
باعث مرجع خلائق۔

چند قدم آگے چلیں تو بازار کے بائیں طرف کوچہ فقیر خانہ آتا ہے جس میں فقیر
ظفر الدین رہتے تھے اور ان کے سامنے ہی وہ مکان ہے جس میں میر ناظر حسین
ناظم عمر بھر اقامت گزیں رہے۔ اس مکان سے ذرا آگے چل کر فقیر سید حسین الدین کا
مکان اور امام بارہ ہے۔ اس میں ان کے بڑے داماد سید علی شاہ رہتے تھے جن کی
مصوری کی شہرت اس امر کے باوجود کہ انہوں نے اسے ایک پیشے کی حیثیت سے کبھی
اختیار نہ کیا محتاج بیان نہیں۔ بڑے بڑے مصوران کی خدمت میں آتے اور ان سے
رنگ آمیزی کا فن سیکھتے۔ مناظر قدرت کی جو صحیح عکاسی ان کے موءِ قلم نے کی، وہ کسی
دوسرے مصور کی چابک دستی کو نصیب نہ ہوئی۔ ان کی سخن فہمی کا یہ عالم تھا کہ جو اشعار
بھی ان کے ذہن میں محفوظ تھے اور ان کی تعداد حد و شمار سے باہر تھی۔ بڑے بڑے
شعراء کے نتائج فکر کا آئینہ تھے۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر یہی محسوس ہونے لگتا کہ

فطرت کے عجائبات کا ایک نگار خانہ ہے جس کے پٹ کھل گئے ہیں اور ...
ایک چمنستان ہے جس پر بہار آ گئی ہے۔ انہوں نے بڑی طویل عمر پائی ...
قریب ایک سو بیس سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔

فقیر عزیز الدین رحمۃ اللہ علیہ:

بازار میں آگے چل کر دائیں طرف فقیر سید عزیز الدین کی حویلی ...
بعد ان کے بیٹے فقیر سید جمال الدین کو ورثے میں ملی۔ آج کل اس میں ...
واقع ہے۔ اس امام باڑے کے سامنے ایک قدیم مسجد تھی جسے مغل دور ...
نے بنایا تھا، مگر اب زمانے کے گرد و غبار نے اسے خستہ کر دیا تھا۔ آج ...
سال پہلے محلہ کاغذیاں کے ایک جواں سال عالمِ دین حافظ محمد شاہد اقبال ...
اٹھے، انہوں نے اس مسجد کو سنبھالا اور اسے ازسرِ نو تعمیر کروا کر آباد کر دیا۔ ...
حافظ شاہد اقبال کی نگرانی میں ''مسجد سیدنا صدیق ابوبکر'' کے نام سے ...
ایک دار التصنیف اور ایک دار التبلیغ بن گئی ہے۔

کچھ دور آگے چل کر تحصیل بازار آتا ہے جہاں اس زمانے میں لاہور کے ...
کی کچہری ہوا کرتی تھی۔ اس کچہری کے مقابل ایک مکان ہے جس میں ...
پنجاب اور رسالہ ''تہذیب نسواں'' کے مالک سید ممتاز علی رہتے تھے اور اسی ...
ایک عرصے تک مولانا محمد حسین آزاد بھی رہے۔ اس کوچے کے مقابل ایک ...
جسے اس زمانے میں سمیاں کا بازار کہتے تھے اور اس کے ساتھ ہی جج بازار ...
بازار میں ایک طرف سر شہاب الدین کا مکان اور چھاپہ خانہ تھا اور دوسری ...
''تاریخ لاہور'' کے مشہور مصنف جج سید محمد لطیف کی حویلی ہے۔ وہ اس زمانے میں ...
جج تھے اور اسی نسبت سے یہ بازار اب ''جج محمد لطیف بازار'' کہلانے لگا ...
بازار میں ایک اور بزرگ بھی رہتے تھے جن کا نام مولوی عبدالغنی تھا۔ وہ ...
کے عہدے پر فائز تھے۔ انہی کے بھانجے نے میاں شمس الدین کے مکان ...

... مدت تک قیام رہا اور یہیں ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔
... مکان سے ذرا آگے چل کر پروفیسر عبدالغنی کا مکان تھا جو اپنے زمانے میں
... اسلوب نگارش کے فہم میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے تھے، بعد میں اپنے
... کی بدولت اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ وہ انگریزی ادب کے
... ماہرین میں شمار ہوتے اور ایک معلم کی حیثیت سے بڑے باکمال استاد تھے۔
... آگے چلیں تو وہ بازار آتا ہے جو آج کل ٹبی بازار کہلاتا ہے۔ زمانے کی
... بھی عجیب ہیں۔ مغلوں کے زمانے میں اور اس کے بعد سکھوں کے عہد میں
... میں عمائدِ حکومت کی حویلیاں تھیں مگر جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس
... میں اس بازار میں زیادہ تر طوائفوں ہی کے ڈیرے آ جمے تھے۔ ہاں اس بازار
... ایک عالیشان شاہجہانی مسجد بھی ہے اور انجمن نعمانیہ کا مدرسہ بھی ہے۔ جس میں
... اسلامیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طوائفوں کے محلے کے درمیان چشمہ فیض جاری ہوا
... طوائفوں کے مکانوں کے گھیرے میں اس مسجد کو دیکھ کر ایک دن میر ناظر حسین
... انجمن نعمانیہ کے سالانہ جلسہ میں ایک زبردست نظم سنائی جس میں غالب کا یہ
... برجستہ دہرا دیا اور سننے والوں نے لطف اٹھایا۔

ع مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے!

... محرم علی چشتی رحمۃ اللہ علیہ:

جہاں یہ بازار ختم ہوتا ہے اس کی بائیں طرف شیخوپوریوں کا بازار ہے۔ اس کے
... پر ایک مکان ہے جس میں اس زمانے میں مولوی محرم علی چشتی رہتے تھے۔ یہ
... چشتیہ لاہور کے ایک نامور فرزند تھے۔ یہ پنجاب کے ایک اخبار ''رفیق ہند''
... ایڈیٹر تھے اور رفتہ رفتہ ان کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ جسے وہ چاہتے لاہور
... کمیٹی کا ممبر منتخب کرا دیتے۔ اسی لیے لوگ انہیں ''کنگ میکر'' کہتے تھے۔ بعد
... وہ اس مکان سے اٹھ کر ہیرا منڈی کے عقب میں ایک وسیع حویلی میں رہنے لگے۔

بڑے علم دوست تھے اور خود بھی اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر [illegible]
کابلی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ ان کے ہاں اکثر حال و قال کی مجالس [illegible]
تھیں۔ ان کا دستر خوان اس قدر وسیع تھا کہ مشائخ کرام اپنے مریدوں [illegible]
کے ساتھ ہندوستان کے ہر گوشے سے آتے اور انہیں کے ہاں قیام فرماتے [illegible]
کے نیچری خیالات سے اختلاف رکھتے تھے اور ان کی مخالفت میں اپنا [illegible]
ہند" میں اداریئے لکھتے تھے۔ آپ عقیدہ کے لحاظ سے سخت سنی تھے اور اعلیٰ [illegible]
فاضل بریلوی کے نظریات کے نہ صرف قدردان تھے بلکہ ترجمان تھے۔

میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی میاں جلال الدین کے صاحبزادے [illegible]
پنجاب کے سابق گورنر میاں امین الدین بارود خانے کے بازار میں رہتے تھے [illegible]
بڑے علم دوست بزرگ تھے۔ ان کا گھر علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ ادیبوں شاعروں [illegible]
اور ماوٰی تھا۔ یہاں شعراء کی مجالس جمتی تھیں۔ دونوں بزرگ غریب شعراء اور [illegible]
کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی رئیس اعظم لاہور میاں [illegible]
مرحوم کا مکان تھا۔ میاں شمس الدین کے چھوٹے بھائی کے صاحبزادے [illegible]
امیر الدین نے لاہور کی سیاست میں بڑا نام پایا۔ علامہ اقبال کی بیٹی [illegible]
الدین اسی میاں امیر الدین کے صاحبزادے میاں صلاح الدین سے بیاہی گئی [illegible]
اور میاں محمد اسلم جن کا نام ایک ناولسٹ اور افسانہ نگار کی حیثیت سے محتاج تعارف [illegible]
نہیں۔ میاں نظام الدین کے بیٹے ہیں۔ محمد الدین تاثیر جن کے علم و فضل کا [illegible]
اردو انگریزی دونوں زبانوں میں جن کا اسلوب نگارش آج بھی طلبہ کے دل [illegible]
ہے اور جو ایک مدت تک اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل رہے، اسی خاندان سے تعلق
رکھتے تھے اور بارود خانے ہی میں رہتے تھے۔

حکیم یوسف حسن جو "نیرنگ خیال" جیسے مقبول عام اردو رسالے کے مالک [illegible]
تھے اور ایڈیٹر بھی، شروع شروع میں اسی بازار میں رہتے تھے، وہ طبیب بھی [illegible]

[illegible] بھی تھے اور خاکسار بھی۔ ہر اسلامی تحریک میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے اور اردو
[illegible] مقبول عام بنانے میں انہوں نے اپنے رسالے کی قیمت اتنی کم کر دی کہ اپنا
[illegible] داؤ پر لگا بیٹھے۔ بارود خانے کا علاقہ جن مایہ ناز ادیبوں کی سکونت کی بدولت
[illegible] ادب میں شہرت رکھتا تھا، ان میں حکیم یوسف حسن کا مرتبہ کسی سے کم نہیں۔

[illegible] بارود خانے سے آگے جائیں تو شاہی قلعے کے عقب میں ایک میدان آتا ہے جو
[illegible] کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کسی زمانے میں مغل فوجوں کی خیمہ گاہ تھی، جس
[illegible] کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت یہ ایک بے آب و گیاہ ڈھلوان تھی۔ اس سے
[illegible] چلیں تو ایک بازار آتا ہے، جسے موتی بازار کہتے ہیں۔ یہ چوک سر جن سنگھ سے
[illegible] اور مستی دروازے تک چلا جاتا ہے۔ اس میں ایک بہت مشہور طبیب اور نیک
[illegible] انسان حکیم سید بزرگ شاہ رہتے تھے جو لاہور کے سادات کے ایک معزز
[illegible] کے نامور رکن تھے۔ خدا نے انہیں ایک ایسا دست شفا بخشا تھا اور ان کی دعا
[illegible] تاب تھی کہ لوگ دور دور سے آتے اور نسخوں کے ساتھ ساتھ ان کے تعویذ بھی
[illegible] جاتے۔ یہ وہی حکیم سید بزرگ شاہ ہیں کہ جب بادشاہی مسجد انگریزوں نے
[illegible] واگزار کی تو آپ کو اس کا پہلا متولی مقرر کیا گیا تھا۔

[illegible] کے لاہور کے خاندان:

[illegible] پرانے زمانے ہی سے لاہور کے دو چار خاندانوں میں طبابت کا پیشہ موروثی
[illegible] ایک تو بازار حکیماں میں ہمارا خاندان تھا کہ اس کا ہر رکن طب کے فن میں ماہر تھا
[illegible] حکیم کہلاتا تھا۔ میں بھی اسی نسبت سے حکیم کہلاتا ہوں۔ دوسرا موتی بازار میں انہی
[illegible] سید بزرگ شاہ کا خاندان تھا۔ ان کے صاحبزادے بھی بیرسٹر ہونے کے باوجود
[illegible] حکیم سید عباس علی ہی کہلاتے تھے۔ تیسرا شاہ عالمی دروازے کے اندر حکیم عالم شاہ کا
[illegible] خاندان جو ان کی ذات والا صفات کے باعث بہت مشہور ہوا۔ چوتھا موتی دروازے
[illegible] اور تیلیوں والے رڑے میں حکیم سید مراتب علی اور حکیم سید نوازش علی کا خاندان۔

حکیم سید نوازش علی نے سو برس کے قریب عمر پائی۔ پاکستان بننے کے بعد ان
ہوا اور بعد میں ڈاکٹر سید دلاور حسین قادری جو سلسلہ غوثیہ کے رکن رکین
نعمانیہ کے صدر رہے تھے، اسی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اور
منڈی میں حکیم سید بہادر شاہ کا خاندان۔ یہ شیخوپورہ کے راجہ دھیان
طبیب تھے۔ اگرچہ سکھوں کے زمانے میں لاہور میں لالہ حاکم رائے اور
رام جیسے مشہور ہندو اطباء فن طب میں یکتائے روزگار مانے جاتے تھے
کا میں ذکر کر رہا ہوں اس میں ہندو زیادہ تر مغربی طریقہ علاج کی طرف
تھے اور مغربی طب میں دو تین مسلمان ڈاکٹروں کے سوا جس طرف بھی
ہی نظر آتے تھے۔

اسی گلی کے اندر ایک مسجد ہے جس کے امام خطیب حافظ خیر محمد ایک
بزرگ تھے۔ ان کا ذکر میں نے اسی لیے کیا ہے کہ یہ اسلام کی حقیقی
تھے۔ دن بھر کتابوں کی جلد بندی کرتے اور اس کی مزدوری ہی پر گزر
کرتے لیکن مسجد میں پانچوں وقت باقاعدہ نماز پڑھاتے اور صبح و شام
دیتے۔ انہیں طبابت میں بھی بہرہ وافر حاصل تھا اور لوگ ان کے تعویذوں
اعتقاد رکھتے تھے۔ اس قسم کے بزرگوں کا اب قحط الرجال ہے۔ کوئی مانے
میرا تو اس بات پر یقین ہے کہ جس دینی یا دنیاوی خدمت کا مآل و مقصد
نمائش و شہرت ہو نہ تو وسیلہ عزت ہوتی ہے نہ باعث برکت۔

مولانا غلام قادری بھیروی رحمۃ اللہ علیہ:

اس بازار کے آگے چل کر مستی دروازے کے قریب ایک مسجد ہے
شاہی مسجد" کہتے ہیں جو سکھوں کے زمانہ میں بارود خانہ بنادی گئی تھی۔ اس
اور خطیب مولانا غلام قادر بھیروی تھے۔ حسب و نسب کے لحاظ سے یہ بھیرہ
تھے اور چمکنی کے صاحب فیض پیر صاحب کے سلسلۂ قادریہ میں مرید

سیالوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز ہونے کی وجہ سے چشتی سلسلہ سے بھی وابستہ
اور فارسی کے علوم میں ان کو وہ دستگاہ حاصل تھی کہ بڑے بڑے عالم و فاضل
سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ میرے والد جو اپنی زندگی کے ابتدائی
دہلی میں قاضی القضاۃ ہند، صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ سے
علم کر چکے تھے، عربی زبان کے فاضلِ اجل ہونے کے باوجود اپنی عربی اور
کی تصنیفات مولانا غلام قادر بھیروی ہی کو دکھاتے تھے اور ان سے اصلاح
مجھے بھی اپنے بچپن میں ان کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اور مَیں نے اکثر
درس دیتے وقت بھنے ہوئے چنے اور منقیٰ چباتے رہتے تھے۔ بعد میں مجھے
اسی پر ان کی خوراک کا دار و مدار ہے۔ ہاں مَیں نے یہ بھی دیکھا کہ ان
و تدریس کا سلسلہ انہیں لوگوں تک محدود ہے جو علم و فضل میں منتہائے کمال کو
تھے۔ بچوں کو درسِ قرآن دینے کے لیے ان کے ایک شاگرد اور مرید تھے جو
جی" کہلاتے تھے۔ اس فقیر گوشہ نشین کو مَیں نے اس زمانے میں دیکھا جب
ان کے علم و فضل کو پرکھنے کی استعداد نہ تھی۔ مَیں تو ان کی خدمت میں محض
سعادت و شرف کے لیے حاضر ہوتا تھا اور وہ اس لیے کہ میری "بسم اللہ" کی
مردِ حق آگاہ کی زبان سے ادا ہوئی تھی۔ نام و نمود سے ان کو نفرت تھی اور اپنے
کام۔ مَیں نے جب کبھی انہیں دیکھا، مسجد کے محراب کے قریب ایک مصلّی پر
دیکھا۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ ہمارے گھر میں ان کا نام بڑے احترام سے لیا
وہ راسخ العقیدہ سنی عالمِ دین تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ادنیٰ سی
یا بے اعتنائی برداشت نہیں کرتے تھے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ:

اس مضمون میں بعض بزرگوں کے علم و فضل کا تذکرہ محض اشارۃً کیا گیا ہے لیکن ہم
روزگار شخصیت حضرت مولانا فیض الحسن سہارنپوری کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپور کے رہنے والے تھے اور قاضی القضاۃ مولانا صدر الدین
مفتی صدرالدین آزردہ کے شاگرد۔ اپنی تعلیم کے زمانے میں انہیں مولانا امام بخش
صہبائی، حکیم مومن خان مومن، میرزا اسداللہ خان غالب اور شیخ محمد ابراہیم ذوق کی
صحبت کا بھی شرف حاصل رہا تھا، ابتدا میں اپنا کلام مولانا امام بخش صہبائی کو دکھاتے
رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران دلی سے نکل کر اپنے وطن مالوف سہارن
پور چلے گئے۔ اس کے بعد علی گڑھ جا کر عربی کی چند کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا
۱۸۷۰ء میں لاہور آگئے۔ ڈاکٹر لائٹنر ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ
انہیں اسی سال اورینٹل کالج میں شعبہ عربی کا صدر مقرر کر دیا۔ لاہور میں ان کا قیام
بھاٹی دروازے کے اندر بازار حکیماں میں رہا ۱۸۷۱ء میں انہوں نے اسلام کی سیاسی
اور علمی تاریخ پر دو جلدوں میں "سنین اسلام" کے نام سے ایک بڑی مفید تالیف شائع
کی۔ ان کی تصنیفات سے ان کے علم و فضل کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ "حیات
شبلی" میں سید سلیمان ندوی کا یہ قول مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے علم و فضل کی عظمت
پر شاہد ہے۔

"مولانا فیض الحسن سہارنپوری اس پائے کے ادیب تھے کہ خاک ہند نے
صدیوں میں شاید ہی کوئی اتنا بڑا امام الادب پیدا کیا ہو"۔

میرے والد حکیم شجاع الدین شاعری میں انہیں کے شاگرد تھے۔ مولانا فیض الحسن
سہارنپوری کا ہر شعر ان کے جوہر کمال کا آئینہ دار ہے۔ میں نے حضرت علامہ اقبال کو
بھی اکثر ان کے اشعار پڑھتے اور ان کی تعریف کرتے سنا ہے۔ مولانا فیض الحسن
سہارنپوری نے سترہ برس تک اورینٹل کالج لاہور کے طلبہ کو اپنی شاگردی کی سعادت
سے فیض یاب کرنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں انتقال فرمایا۔

مولانا عبدالحکیم کلانوری رحمۃ اللہ علیہ:

شمس العلماء مولانا عبدالحکیم کلانوری اورینٹل کالج لاہور میں ۱۸۷۲ء سے ۱۹۱۶ء

تک صدر مدرس فارسی کے عہدے پر فائز رہے۔ وہ سنی العقیدہ عالم دین تھے۔ ان کو
میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ بہت وجیہ انسان تھے اور ان کی گفتگو کا انداز
ایسا تھا جیسے کوئی اچھی طرح سوچ سمجھ کر بات کر رہا ہو۔ شام کے وقت اکثر میرے
والد حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آ بیٹھتے۔ جب وہ آتے تو حضرت علامہ اقبال بھی ان
کے قریب بیٹھتے اور زیادہ تر انہیں سے مخاطب ہوتے اور شعر و شاعری کے ادبی محاسن
پر گفتگو کرتے۔ انہوں نے قواعد فارسی کے علاوہ عروض صنائع و بدائع اور املاء کے
اصول پر کئی رسالے لکھے ہیں جن سے فارسی ادب کے طلبہ کو اکتساب علم میں بڑی
مدد ملی ہے۔ ان کے مکان پر ان کے شاگردوں کا جمگھٹا رہتا تھا اور جب بازار میں
نکلتے تو اس وقت بھی ان کے شاگرد ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور شعر و سخن کی گتھیاں
سلجھانے میں ان کی رہنمائی کے طالب نظر آتے۔ سر پر بہت بڑا عمامہ ہوتا اور بدن پر
ایک ڈھیلا ڈھالا چغہ۔ ہاتھ میں عصا کی وضع کی لکڑی رکھتے تھے۔ آخر کار اورینٹل کالج
میں چوالیس برس تک استادی کے فرائض انجام دینے کے بعد ملازمت سے سبکدوش
ہو گئے۔ اردو فارسی اور عربی میں ان کی کئی تصنیفات مشہور ہیں۔

مفتی محمد عبداللہ ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ:

شمس العلماء مفتی محمد عبداللہ ٹونکی ۱۸۸۳ء میں اورینٹل کالج میں عربی کے مدرس
مقرر ہوئے اور ۱۸۸۷ء میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے انتقال کے بعد عربی
کے صدر مدرس کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ان کے صاحبزادے مفتی انوار الحق
بھی کالج میں ایک مدت تک ناظم تعلیمات رہے۔ مفتی عبداللہ ٹونکی فقہ اسلامی کے بہت
بڑے عالم تھے۔ اسلامی قانون اور شرعی تنازعات میں ان کا فتویٰ ناقابل تردید سند
تصور ہوتا تھا۔ وہ بہت کم بولتے تھے لیکن جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا، برہان قاطع
کا حکم رکھتا تھا۔ یہ بھی ہر شام حکیم شہباز دین کی علمی و ادبی بیٹھک میں آ بیٹھتے تھے۔
ان کی مجلس میں بیٹھنے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کا پیشہ وکالت تھا اور کچھ ایسے

بھی جن کو قرآنی احکام کی حکمتوں کو سمجھنے کا شوق تھا۔ اس باب میں مفتی محمد
کی رہنمائی ان لوگوں کے بڑے کام آتی۔

مفتی محمد عبداللہ بہت دبلے پتلے انسان تھے۔ پان ہر وقت چباتے
جب بات کرتے تو منہ پر رومال رکھ کر بات کرتے تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال
کرتے تھے کہ اُس ناتواں جسم میں علم وفضل کا اتنا ذخیرہ ہے کہ کوزے میں دریا
کی مثل ان پر صادق آتی ہے۔ ۷۷ سال تک اورینٹل کالج میں مختلف عہدوں
رہنے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوگئے اور لاہور کو جسے وہ اپنا دوسرا وطن
تھے، داغ مفارقت دے گئے۔ شرع محمدی پر چار جلدوں میں ان کی کتاب
ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ کئی مسائل پر ان کے فتاوٰی رسالوں کی صورت
ہوئے اور تشنگانِ رموز ونکات شرع اسلامیہ نے ان سے بڑا فیض پایا۔
کچھ عرصہ تک دارالعلوم ندوہ میں کام کیا۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ کے صدر
ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں رحلت فرمائی۔ ان کی وفات سے عربی زبان ایک فاضل اجل
اسلامی شریعت ایک بے نظیر نکتہ دان کی ذات سے محروم ہوگئی۔ سید سلیمان ندوی
کے مطابق وفات کے وقت مفتی محمد عبداللہ کی عمر کوئی ستر برس کے قریب تھی
عبداللہ ٹونکی دارالعلوم نعمانیہ کے علمی معاون اور حلقۂ اہل سنت کے بلند پایہ عالم

مولوی محمد حسین آزاد:

اسے بھاٹی دروازے کی خوش قسمتی کہیے کہ جب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے
دلی اجڑی تو دلی کے سب سے پرانے اردو اخبار کے مالک اور ایڈیٹر مولوی محمد
کے بیٹے مولوی محمد حسین آزاد نے انقلاب زمانہ کے گوناگوں مصائب سے تنگ
اپنے وطن مالوف سے ہجرت کی اور آخر کار لاہور آ کر بھاٹی دروازے کے اندر
بازار میں گوشہ نشین ہوگئے۔ ان کے علم وفضل کا جوہر ایسا نہ تھا کہ چھپائے
رشتہ تعلیم پنجاب نے لاہور میں ان کی آمد کو غنیمت جانا اور انہیں رشتہ ملازمت

کے جہاں ان کے جوہر کمال کی قدر دانی کی وہاں ان کے لیے ایسے مواقع
پائے کہ ان کی شہرت کا آفتاب جسے گردشِ تقدیر سے گہن لگ چکا تھا، افقِ علم
بڑی درخشانی سے چمکنے لگا۔ محکمہ تعلیم میں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد
محمد حسین آزاد ۱۸۸۷ء میں اورینٹل کالج میں شعبہ فارسی کے سپرنٹنڈنٹ مقرر
اور اسی سال انہوں نے شمس العلماء کا خطاب بھی پایا۔ مولانا محمد حسین آزاد کے
کارنامے محتاج تعارف نہیں۔ پنجاب میں اردو زبان کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے
جو سنہری کارنامے ان کی ذات سے منسوب ہیں وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتے
آبِ حیات، نیرنگِ خیال، قصص الہند اور دربارِ اکبری جیسی مستند تصانیف ان
کی وسعت اور دنیائے ادب میں ان کے مرتبے کی عظمت پر شاہد ہیں لیکن سب
احسان جو انہوں نے اردو زبان کے طلبہ پر کیا ہے، یہ ہے کہ انہوں نے کرنل
کے ایما پر جو اس زمانے میں سررشتہ تعلیم کے ناظم الامور تھے، اردو نصاب کی
لکھیں۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان کے لکھے ہوئے نصاب
اس سلسلے میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انہیں کی دکھائی ہوئی راہ کی پیروی تھی، مگر کسی
وہ بات بن نہ آئی جس کی طرح وہ ڈال چکے تھے۔ ایک اور احسان جو انہوں
اردو شاعری پر کیا، وہ یہ تھا کہ اسے غزل کے پرانے ڈگر سے ہٹایا اور اس کی انگلی
اسے نیچرل شاعری کی نئی راہوں پر چلانے لگے۔ انجمن پنجاب کے مشاعرے
"خال ورخِ یار"، "گیسوئے خم دار" اور "حسن وعشق" اور "ہجر ووصال" کے خیالی
نہ رہے بلکہ مظاہر فطرت کے وہ عجائب خانے بن گئے جن کے نوادر کو دیکھ
عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ وہ ایک بے مثال ادیب اور ایک عدیم النظیر شاعر تھے۔
تو انہیں لاہور کے شیعوں نے تکیہ گامے شاہ بیرون بھاٹی گیٹ میں دفن کر دیا۔

شہاب الدین مرحوم:

بھاٹی دروازے کے اندر سر شہاب الدین جیسے معروف علم دوست اور سخن نواز

سیاسی راہنما رہتے تھے۔ وہ ہر شام کو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں آتے تھے۔
اقبال سے ان کے بے تکلفانہ مراسم پر بے شمار لطائف شاہد ہیں۔ جن کے
اس مضمون میں گنجائش نہیں۔ اپنی محنت اور مشقت سے بہت دولت کمائی
دولت کا بیشتر حصہ یا تو خدا کی راہ میں صرف کیا یا اپنے دور و نزدیک کے رشتہ
دیا۔ نادر اور بیش قیمت کتابیں جمع کرنے کے شوق نے ان کی ذاتی لائبریری کو
بے نظیر کتب خانہ بنا دیا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کی وصیت کے مطابق اب
یونیورسٹی لائبریری کا ایک بے بہا سرمایہ ہے۔ اسی وصیت کے مطابق وفات
وہ اپنی قیمتی زمین جو شاہدرہ ریلوے اسٹیشن کے سامنے واقع ہے، انجمن حمایت
دے گئے تھے۔ عمر بھر ان کا دولت کدہ سیاسی تحریکوں کا اکھاڑہ بنا رہا جس
سیاست فروش نے زور آزمائی کی۔ سر شہاب الدین نے کبھی اس پہلوان کی
کبھی اس پہلوان کو پٹکنی دی۔ سیاست کے فن میں ایسے ماہر تھے کہ جیت ہمیشہ
رہتی تھی۔ بڑے بلند قامت اور رعب داب والے انسان تھے۔ آواز میں ایسا جلال
کہ جب ٹیلی فون پر بات کرتے تو ٹیلی فون کے تار رعشہ بر اندام ہو جاتے۔
قانون ساز میں ان کی آواز کسی مائیکروفون کی محتاج نہ تھی۔ قوت حافظہ کا یہ حال
پارلیمنٹری پریکٹس کی کتابوں کے صفحوں کے صفحے ازبر تھے۔ ان کی قانون دانی سے
قانون ساز کا ہر رکن مرعوب رہتا تھا اور ان کی نکتہ وری کا لوہا سبھی مانتے تھے۔ میں نے
سے ان کے دم واپسیں تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور سچ بات تو یہ ہے کہ اس رفاقت سے
فیض پایا۔ اس سرچشمہ فیض کی اتنی خوبیاں مجھے یاد ہیں کہ ان کے بیان کے لیے اس
مضمون میں نہ گنجائش ہے نہ وسعت۔ بس یہی کہہ دینا کافی ہے کہ سر شہاب الدین
خود ایک محفل تھے اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو یہ محفل بھی سونی ہو گئی۔

مولانا تاج الدین احمد منصرم، انجمن نعمانیہ:

ماہر قانون مولوی احمد دین بھی تحصیل بازار میں ''وان والی گلی'' میں رہتے تھے۔

ان کے مکان سے ملحق مولوی تاج الدین کا مکان تھا جو ان مسلمان گریجویٹوں میں
تھے جنھوں نے انگریزی زبان میں بے مثال مہارت پیدا کرنے میں بڑا نام
بھی پہلے سررشتہ تعلیم پنجاب میں ملازم ہوئے اور بعد میں ریاست پٹیالہ کے محکمۂ
تعلیم کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ بڑے متین اور صائب الرائے بزرگ تھے، شیخ
عبدالقادر، مولوی احمد دین اور مولوی تاج دین پرانی وضع کے اس قدر پابند تھے کہ میں
نے انہیں ان کی جواں سالی کے زمانے میں بھی کبھی بے ریش نہیں دیکھا۔ یہی مولوی
تاج الدین ایک عرصہ تک انجمن نعمانیہ کے سیکریٹری رہے اور اس دارالعلوم کے
انتظامی معاملات کو احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے۔

علامہ اقبال کے اساتذۂ سخن:

وان والی گلی سے آگے چل کر اسی تحصیل بازار میں ایک اور کوچہ ہے جسے بھابڑوں
کی [illegible]ڑیاں کہتے ہیں۔ خواجہ رحیم بخش، خواجہ کریم بخش اور خواجہ امیر بخش تینوں بھائی اسی
کوچے میں رہتے تھے۔ یہ بزرگ اپنی عزلت گزینی کے باعث منظر عام پر نہیں آئے،
مگر وہ اس محفل کی روح و رواں تھے جو حکیم شہباز دین کی بیٹھک میں ہر شام کو جمتی
تھی۔ ان کی جرات تنقید اور جوہر شناسی نے اس زمانے کے نوجوان ادیبوں اور
شاعروں کی تربیت میں بڑا حصہ لیا۔ جب تک سر محمد اقبال اپنا کلام ان بزرگوں کو نہ سنا
لیتے تھے، اسے کسی مجلس عام میں نہ پڑھتے تھے۔ ''نالۂ یتیم''، ''ہلالِ عید''، ''تصویر درد''
''شمع و شاعر'' کی سی مشہور و معروف نظمیں اقبال نے پہلے انہیں لوگوں کے سامنے
پڑھیں اور پھر ان سے دادِ سخن پا کر انہیں انجمن حمایت اسلام اور انجمن نعمانیہ کے
سالانہ جلسوں میں پڑھ کر دنیائے اسلام سے خراج تحسین و عقیدت وصول کیا۔ خواجہ
فیروز الدین بیرسٹر ایٹ لاء جو اقبال کے ہم زلف تھے اور جنھوں نے آگے چل کر ایک
کامیاب وکیل کی حیثیت سے بڑا نام پایا اور تحریک پاکستان میں بڑا کام کیا۔ انہی
خواجہ رحیم بخش کے بیٹے تھے۔ اور خواجہ عبدالمجید ''جامع اللغات'' جیسی جامع اور ضخیم

لغت کے مصنف خواجہ کریم بخش کے صاحبزادے تھے۔
کے مؤلف کی وسعت نظر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ رموز
سرکاری ملازمت کی مصروفیتوں کے باوجود عمر بھر کس انہماک سے
کی تکمیل کے درپے رہا جو آج اردو ادب کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔
کہ یہ فیض اسی گھرانے کا ہے جس کے جوار عاطفت میں ان دونوں
پرورش پائی۔

دارالعلوم نعمانیہ:

بھاٹی دروازے کے اندرونی محلوں اور گلیوں کے جن اہل علم
حضرات کا ذکر کیا گیا ہے ان کی وجہ سے یہ علاقہ لاہور کا گہوارۂ علم و ادب
انگریزوں نے اس محلّہ کو جب طوائفوں کے حوالے کیا تو یہاں کی علمی اور
مغنیہ کی دھنوں اور رقص و سرود کی محافل میں دب گئیں۔ علاقہ کے معززین
کر کے لاہور کے دوسرے علاقوں میں جا بسے۔ شاعری کی محفلیں اور تعلیمی
منتقل ہونے لگے باایں ہمہ اس علاقہ میں ''انجمن نعمانیہ'' کا واحد دارالعلوم
کی گندگی کے باوجود بھاٹی دروازے کے اندر علم و فضل کے چشمے کی طرح
میں برصغیر کے جلیل القدر علماء آتے، قیام کرتے، تقاریر کرتے، تدریس کا
اور ہزاروں طلبہ دینی علوم سے دامن شوق بھرتے۔ اس دارالعلوم میں
جماعت علی شاہ علی پوری، سید دیدار علی شاہ الوری اور پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی
علیہم جیسے باکمال لوگ اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ قیام
مولانا محمد حسین فیضی، مولانا غلام احمد صاحب حافظ آبادی، حافظ قرآن و
غلام مرشد، محرم علی چشتی ایڈووکیٹ، مولانا غلام قادری بھیروی، مولانا وصی
مولانا عبداللہ ٹونکی جیسے بلند پایہ علماء علم و عرفان کے دریا بہاتے۔ انجمن
دارالعلوم ۱۸۸۷ء میں بادشاہی مسجد میں قائم ہوا تھا، مگر ۱۹۱۱ء میں اپنی عمارت

دروازے کے اندر ہے اور یہاں سے ہزاروں طلبہ دینی علوم پڑھ کر
کے کارپردازان صحیح سنی العقیدہ تھے جنہیں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی
رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ اعلیٰ حضرت کے شاگرد، ان
کے خلفاء اس دارالعلوم کی علمی خوشبوؤں کو چاردانگ عالم میں پھیلاتے
العلوم نعمانیہ کے بلند پایہ علماء کا ذکر کیا جائے تو ہمیں ایک اور ''محفلِ اذکار''

دروازہ لاہور کا مرکزِ علم و ادب رہا ہے۔ اس کے گلی کوچے اور خستہ حال
ابھی تک ان مشاہیرِ علم و ادب کی نشاندہی کرتے ہیں جنہوں نے بیسویں
میں اپنا نام پیدا کیا اور جہاں سے علم و فضل کے قافلے روانہ ہوتے رہے ہیں۔

(''جہانِ رضا'' اپریل، مئی ۲۰۰۰ء)

مضمون حکیم احمد شجاع کے مضمون ''لاہور کا چیلسی'' مطبوعہ مجلّہ نقوش لاہور سے
ہے لہٰذا جہاں کہیں صیغہ واحد متکلم استعمال کیا گیا ہے اس سے مراد حکیم احمد شجاع

لاہور کے پچاس سالہ خیابانِ علم و سخن پر ایک نظر

''جہانِ رضا'' اپریل مئی کے شمارے میں ''بھاٹی دروازہ لاہور کا علمی خیابان'' کے موضوع پر ایک مضمون شائع ہوا تھا جسے بہت سے قارئین نے پسند کیا۔ اہل علم و فضل حضرات نے بڑی تعریف کی۔ خصوصاً عمر رسیدہ حضرات نے تو یہاں تک لکھا کہ ہم نے اکثر علمائے کرام اور ان مقامات کو اپنی آنکھوں دیکھا ہے، جن کا ذکر اس مضمون میں آیا تھا۔ ان حضرات کے ذوقِ مطالعہ اور یادوں کو تازہ کرنے کے لیے ہم سابقہ پچاس سالہ لاہور کی علمی شخصیات کی یادوں سے وقت کی غبار کو جھاڑ کر قارئین ''جہانِ رضا'' کو دعوتِ مطالعہ دے رہے ہیں۔

مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ:

پاکستان بنا تو لاہور میں مہاجر اہلِ علم و فضل بھی لٹے پٹے قافلوں کے ساتھ آئے۔ مقامی اہلِ علم بھی اپنی اپنی قیام گاہوں میں موجود تھے۔ ان ''مہاجرین اور انصار'' علمائے کرام کے باہمی روابط نے لاہور کو خیابانِ علم و فضل بنا دیا۔ لاہور شہر کی شکست و ریخت کے باوجود اس کے گلی کوچے ان حضرات کی علمی خوشبوؤں سے مہکتے رہے۔ لاہور کے دروازوں کے اندر تمام محلوں میں علماء و شعراء کا بسیرا تھا۔ گلی گلی، کوچہ کوچہ ان چراغوں سے روشن تھا۔ مسجد وزیر خان لاہور کے قلب میں واقع ہے۔ اپنی شان و شوکت اور خوبصورتی کے ساتھ سارے شہر کے حسن و جمال کو دوبالا کرتی ہے۔ پاکستان بنا تو اس مسجد کے خطیب مولانا ابوالحسنات سید محمد قادری رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی باوقار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ الوری کے فرزندِ ارجمند تھے، جنہوں نے لاہور کے دینی حلقوں میں اپنا لوہا منوا رکھا تھا۔ مولانا سید ابوالحسنات

ایک عمدہ قاری تھے۔ قرآن پڑھتے تو لطف آجاتا۔ آپ نے اردو زبان میں فصاحت و بلاغت کا وافر حصہ پایا تھا۔ تقریر کرتے تو سننے والے دادِ سخن دیتے۔ جمعہ کے خطبہ کے علاوہ جب جلسہ عام میں تقریر کرتے تو سننے والے واہ واکیے بغیر نہ رہتے۔ وہ مسجد وزیر خان لاہور میں مختلف موضوعات پر اہلِ علم کے اجلاس بلاتے اور اس طرح مسجد وزیر خان کی علمی شان قائم رہتی۔ جب مرکزی انجمن حزب الاحناف کے سالانہ اجلاس ہوتے تو لوگ دور دراز سے آتے اور مسجد وزیر خان کی رونقیں عروج پر ہوتیں۔

قاری محمد طفیل امرتسری:

پاکستان بنا تو امرتسر کے ایک قاری محمد طفیل صاحب نقشبندی لاہور آئے۔ وہ مختلف مساجد میں مسند تدریس بچھا کر بیٹھے مگر دل نہ لگا۔ وہ بہت بڑے خوش الحان قاری تھے۔ قرآن پڑھتے تو در و دیوار جھوم جھوم اٹھتے۔ جب انہوں نے مسجد وزیر خان میں مسند تجوید و قرأت بچھائی تو طالب علموں کے جمگھٹے لگ گئے۔ ہم لوگ رمضان شریف میں اپنی اپنی مساجد میں تراویح پڑھ کر مسجد وزیر خان پہنچتے۔ قاری محمد طفیل صاحب قرآن کیا پڑھتے، دلوں کو دھو ڈالتے۔ محراب میں کھڑے تلاوت کرتے تو مسجد وزیر خان کے بیرونی دروازے میں کھڑے لوگ ایک ایک لفظ سن پاتے۔ اتنی بڑی مسجد میں نمازیوں کی صفیں دیدنی ہوتیں۔ چند سال بعد قاری محمد طفیل کو ملتان اور حیدرآباد سندھ کے عقیدت مند لے گئے اور انہوں نے زندگی کا آخری دور وہاں تدریسِ قرات میں گزار دیا۔

مسجد وزیر خان کے حجروں میں کئی حضرات زہد و عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ غزنی کے ایک جواں سال عابد سارا دن عبادت کرتے مگر آدھی رات ہوتی تو حجرے سے باہر آتے۔ پانی کے حوض کے کنارے بیٹھ کر پانی سے کھیلتے۔ وہ دو تین گھنٹے حوض کے کنارے بیٹھے رہتے اور اللہ اللہ کرتے۔ ہم لوگ کبھی کبھی ان کے پاس جا بیٹھتے اور ان کے ہاتھوں سے اٹھنے والے پانی کے چھینٹوں سے لطف اندوز ہوتے۔ بس ان

چھینٹوں کو ہی ہم تبرک سمجھتے۔ ایک حجرے میں استاد فیروز الدین مصور کا قبضہ تھا وہ
بڑے نفیس مصور تھے۔ انہوں نے وزیر خان کی مسجد کے درو دیوار کے تمام نقوش اپنے
ٹریسنگ پیپروں پر اتارے تھے۔ ان کے رنگوں کو محفوظ کرتے جاتے۔ اس طرح نہ
صرف وہ مغل مصوری کے وارث تھے بلکہ ان کے کئی شاگرد بھی مغل دور کی مصوری کی
مشق کرتے تھے۔ ان دنوں نہ ایسے کیمرے آئے تھے نہ ایسے کمپیوٹرز جو نقش کا عکس
اتار لیتے ہیں۔

مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ:

دہلی دروازہ کے باہر کوتوالی ہے۔ اس کی شمالی دیوار کے ساتھ مولانا محمد نبی بخش
حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد ہے۔ اس میں مولانا حلوائی نے ایک دینی درس گاہ قائم کی
ہوئی تھی جس سے بڑے بڑے اہل علم اپنا اپنا حصہ لے کر نکلتے تھے۔ مولانا حلوائی تو
۱۹۴۴ء میں انتقال کر گئے تھے مگر ان کی ''تفسیر نبوی پنجابی'' کے چرچے سارے شہر میں
ہی نہیں سارے پنجاب میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ سنی عالم دین
تھے۔ حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری اور پیر جماعت علی شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ
علیہ کے خلیفہ مجاز تھے۔ آپ کی یہ مسجد اگرچہ چھوٹی سی تھی مگر علم و ادب کی وجہ سے
ایک مرکزی حیثیت رکھتی تھی۔ اب اس مسجد کو از سر نو تعمیر کیا جا رہا ہے۔ سنا ہے کہ
یہاں کے رہنے والے اس وقت کے درویشوں کے ہاتھوں میں جنت کے دروازوں
کی کنجیاں تھیں۔ وہ شیخ عطار کا مصرع برملا پڑھتے۔

ع حُبِ درویشاں کلید جنت است!

کوتوالی کے سامنے دہلی دروازے کے باغ کے ایک کنارے پر ایک چھوٹی سی
مسجد تھی۔ اب یہ ''میلاد چوک والی مسجد'' کہلاتی ہے مگر جس زمانے کی ہم بات کرتے
ہیں، ان دنوں یہ ''باغ والی مسجد'' کہلاتی تھی۔ اس کے امام ایک افغانی عالمِ دین تھے۔
وہ گزر اوقات گھڑیوں کی مرمت کی مزدوری سے کرتے مگر تعویذات دے کر اللہ فی اللہ

اور لاچار لوگوں کی چارہ گری کرتے۔ ہم جب بیمار ہوتے تو مولوی صاحب سے
تعویذ لے کر تندرست ہو جاتے۔ اس مسجد کے ساتھ لاہور کے دہلی دروازہ کے باہر
ایک وسیع باغ تھا جس میں پاکستان بننے سے پہلے ''مجلسِ احرار اسلام'' کے جلسے ہوا
کرتے تھے۔ مگر پاکستان کے بننے کے بعد احراری مقرر اور مولوی چھپے رہتے تھے انہوں
نے تحریک پاکستان میں پاکستان کی سخت مخالفت کی تھی۔ ''مجلسِ احرارِ اسلام'' کا
مرکزی دفتر حضرت شاہ محمد غوث کے مزار کے سامنے واقع تھا۔ اس میں سید عطاء اللہ
شاہ بخاری، مولانا احسان احمد شجاع آبادی، چودھری افضل حق، مولوی محمد علی جالندھری،
شیخ حسام الدین امرتسری، تاج الدین انصاری، مولوی مظہر علی اظہر، شیعہ ذاکر علامہ
شمسی، غلام نبی جانباز، آغا عبدالکریم شورش کاشمیری اور دوسرے اصاغر و اکابر احراری
جمع ہوتے۔ ان سے ملنے کے لیے سیکڑوں دیوبندی مولوی بھی آتے اور ان کی کبھی
کبھی مجالس لگتیں۔ چونکہ یہ تمام لوگ تحریکِ پاکستان کے خلاف تھے اور گاندھی اور نہرو
کے وظیفہ خوار تھے۔ لاہور کے لوگ انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔

لاہور کے اخبارات کے دفاتر:

اس جگہ سے ذرا ہٹ کر شمال کی طرف ایک بڑی حجازی بلڈنگ سے ''روزنامہ
احسان'' نکلتا تھا۔ جس کے ایڈیٹر ملک احسان الٰہی تھے۔ زبردست مسلم لیگی اور تحریکِ
پاکستان کے زبردست حامی۔ جہاں ''روزنامہ انقلاب'' کے دو ''ایڈیٹران کرام''
عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر اپنے قلم کے جوہر دکھاتے۔ وہاں ''روزنامہ احسان''
کے قلم کار اور ''روزنامہ زمیندار'' کے آخری دور کے قلم طراز ایک دوسرے سے چونچیں
لڑاتے اور خوب لڑاتے۔ شورش کاشمیری کا ''چٹان'' اپنی انفرادی شان سے چھپتا اور
اس کے زور قلم کو ہر پڑھا لکھا پسند کرتا۔ وہ نظم و نثر میں یکساں کمال رکھتے تھے۔ اور
''اک رنگ کا مضمون ہو سو رنگ سے باندھوں'' کی تصویر تھے۔ چونکہ شورش کاشمیری
احرار کے ''پیر مغان'' کا ''مغ بچہ'' تھا اس کی سنی اہلِ علم و فضل سے چشمک رہتی تھی۔

ہمارے ایک دوست اس کے بڑے مداح تھے مگر کہا کرتے تھے۔

احرار کی خطاؤں پر رو رو کے عمر بھر
شورش، چٹان زیست سے سر پھوڑتا رہا

جامع مسجد شاہ محمد غوث قادری رحمۃ اللہ علیہ کے خطیب:

مجلس احرار کے دفتر کے سامنے محدث کبیر حضرت شاہ محمد غوث قادری گیلانی
دربار گوہر بار ہے۔اس کے ساتھ ایک جامع مسجد ہے۔اس کے ایک خطیب مولانا
عبدالحنان کابلی تھے۔ایک عابد و زاہد پیر بخاری صاحب تھے۔ پاکستان بنا تو
خطابت پر ایک دیوبندی مولوی مطیع الحق براجمان ہو گئے مگر لوگوں کے احتجاج پر
علیحدہ ہونا پڑا۔مولانا سلطان محمد مرحوم خطیب بنے۔وہ انگریزی اقتدار میں چودہ سال
جیل میں رہے تھے مگر پاکستان بنا تو آزادی ملی۔ بڑے متوکل اور درویش منش انسان
تھے۔غریبوں کی امداد کرتے رہتے اور گھر کے سامنے ہر شام کے وقت بیٹھ جاتے اور
ایک سو غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ان کی وفات کے بعد ہمارے ایک دوست حافظ
محمد عالم سیالکوٹی جو مولانا محمد نبی بخش حلوائی کے مرید اور دار العلوم حزب الاحناف کے
فارغ التحصیل تھے، خطیب بنے۔وہ سیالکوٹ گئے تو مولانا محمد سعید نقشبندی (مترجم
مکتوبات امام ربانی اور کیمیائے سعادت) منبر خطابت پر جلوہ گر ہوئے۔مولانا محمد
سعید نقشبندی کی جگہ ہمارے دوست قاری عطاء اللہ صاحب نے مسند خطابت پر اپنی
تقاریر کا آغاز کیا۔مولانا محمد سعید نقشبندی کچھ عرصہ بعد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ
علیہ کی جامع مسجد کے خطیب مقرر ہوئے اور تاحیات اس منصب پر فائز رہے۔شاہ محمد
غوث کی جامع مسجد کے یہ دونوں خطیب اپنے وقت میں بڑے قد آور علمائے اہل
سنت میں شمار ہوتے تھے۔حافظ محمد عالم نے سیالکوٹ پہنچ کر مسند تدریس بچھائی تو
ہزاروں طلبہ کو حافظ، قاری اور عالمِ دین بنایا اور مولانا محمد سعید نقشبندی نے دار العلوم
نعمانیہ لاہور میں مسندِ تدریس بچھائی اور تالیف و تصانیف میں اپنا نام پیدا کیا۔

سردار عبدالرب نشتر اور پیر محمد امیر شاہ قادری:

حضرت شاہ محمد غوث کے سجادہ نشینوں سے پنجاب کے نیک نام گورنر عبدالرب
نشتر کے دوستانہ مراسم تھے۔وہ اس دربار پر حاضری دیتے اور حکومت کی مشینری بھی
اس مزار کے اردگرد گھومتی مگر پشاور کے ایک عالم و فاضل سجادہ نشین مولانا سید محمد امیر
شاہ قادری گیلانی مدظلہ العالی جو سلسلہ قادریہ کا ایک روشن چراغ ہیں، اور ہمارے کرم
فرما ہیں۔ہمارے ان سے نیازمندانہ مراسم ہیں۔جب انہوں نے تذکرہ علماء مشائخ
سرحد، ترجمہ شرح بخاری مولفہ حضرت شاہ محمد غوث اور انوار غوثیہ شائع کیں تو اہلِ علم
نے انہیں ہدیۂ تحسین پیش کیا۔

دار العلوم حزب الاحناف لاہور:

مرکزی انجمن حزب الاحناف کا دار العلوم ان دنوں دہلی دروازے کے اندر چنگڑ
محلہ میں واقع تھا۔یہ دار العلوم حضرت مولانا سید دیدار علی شاہ الوری رحمۃ اللہ علیہ نے ١٩٢٣ء
میں قائم کیا پھر ان کے نامور بیٹے ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بامِ عروج
پر پہنچا دیا۔علامہ ابوالبرکات نے زندگی کا ایک طویل حصہ اس دار العلوم کے لیے وقف
کر دیا تھا اور سیکڑوں طلبہ کو دولت علم و اعتقاد سے مالا مال کر کے دنیا کے گوشے گوشے
تک پہنچایا۔آج فرزندانِ حزب الاحناف دنیا کے تمام ممالک میں پھیلے ہوئے
خدمات دینیہ سرانجام دے رہے ہیں۔اس دار العلوم کے نامور اساتذہ میں سے ایک
عالم دین مولانا مہر الدین جماعتی نے تدریسی اور فنی دنیا میں بڑا مقام پایا۔انہوں نے
پورے چالیس سال دار العلوم حزب الاحناف کے طلبہ کو پڑھایا۔ بڑے زبردست
مدرس تھے۔صرفی، نحوی، منطقی، معقولی، بیانی و لسانی ہر شعبہ فن میں کمال رکھتے تھے۔وہ
شام کو مولانا نبی بخش حلوائی کے مدرسہ متصل کوتوالی آتے اور طلبہ کی ایک شبینہ کلاس کو
پڑھاتے تھے ہم لوگ انہیں کے دسترخوان فیضان کے خوشہ چین ہیں۔مولانا مہر الدین

جماعتی بڑے شفیق استاد تھے۔ چاہ میراں کے نزدیک اپنا گھر بنایا اور ساری زندگی
تدریس علوم اسلامیہ کے لیے وقف کر کے رخصت ہوئے۔

مولانا محمد بخش مسلم رحمۃ اللہ علیہ:

لوہاری دروازے کے باہر ایک باغ کے کنارے پر گل فروشوں کی دکانیں
تھیں۔ انہیں ''پھلیرے'' کہا جاتا تھا۔ ان دکانوں کے ساتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی
جہاں اب ''مسلم مسجد'' کی عظیم الشان عمارت کھڑی ہے۔

اس چھوٹی سی مسجد کے سامنے ایک باغ تھا جہاں گراسی پلاٹ کے علاوہ سایہ دار
درخت سایہ گستر رہتے تھے۔ اس چھوٹی سی مسجد کے خطیب مولانا محمد بخش مسلم بی۔اے
تھے۔ وہ تحریکِ پاکستان کے سچے ترجمان اور خوش آواز مقرر تھے۔ اپنی تقاریر میں
انگریزی جملے بولتے تو حاضرین متاثر ہوتے۔ مولانا مسلم جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر
کرتے تو لوگوں سے سارا باغ کھچا کھچ بھر جاتا۔ لوگ دور دور سے آپ کی تقریر سننے
آتے۔ آپ نے ساری زندگی یہاں ہی خطبہ جمعہ دیا۔ پاکستان بننے سے پہلے یہ لاہور
کی واحد مسجد تھی جہاں تحریک پاکستان کے حق میں آواز بلند ہوتی اور تحریکِ پاکستان
کے خلاف کانگریسی اور احراری مولویوں کے اعتراضات کا کھل کر جواب دیا جاتا۔
مولانا مسلم گورے رنگ کے دبلے پتلے عالمِ دین تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی پہنتے اور تقریر
کرتے تو سیاسی اور دینی معلومات کا چشمہ ابلتا۔ مجلسی گفتگو کرتے تو لطف آجاتا۔
لطائف علمیہ سنانے پر آتے تو دل خوش کر دیتے۔ ان کی شبانہ روز کوششوں نے نہ
صرف ایک زمانے کو متاثر کیا بلکہ اپنی زندگی میں ایک شاندار مسجد کی تعمیر کرا دی۔ آج
اسی مسجد کے زیرِ سایہ آپ آرام فرما ہیں۔ یہ مسلم مسجد کسی وقت میں دینی رونقوں کا مرکز تھی
مگر آج محکمہ اوقاف کے زیرِ اثر مسجدیں ''مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے'' کا نمونہ ہے۔

مولانا محمد شریف نوری رحمۃ اللہ علیہ:

مسجد سے تھوڑا سا آگے آئیں تو شاہ عالمی دروازے کے باغ میں مولانا محمد

شریف نوری قصور سے آکر تقریر کرنے لگے تھے۔ مولانا نوری ایک خوش آواز مقرر
تھے۔ مولانا نور اللہ صاحب نعیمی کے مدرسہ بصیر پور سے پڑھ کر آئے تو ''نوری''
کہلائے۔ اہلِ قصور کو اپنی آواز سے گرویدہ بنا لیا۔ وہاں سے نکلے، لاہور آئے تو تازہ
ہجوم اکٹھا کیا۔ شاہ عالمی دروازے کے باغ سے اٹھے تو میو ہسپتال کے قریب سرائے
رتن چند کی مسجد میں اپنا مرکز قائم کر لیا۔ اپنی خوش آوازی اور خوش بیانی سے لاہور کے
اہلِ ذوق کو دعوتِ سماعت دی۔ مسجد میں جگہ تنگ ہوگئی تو راوی روڈ پر ایک عظیم الشان
''مسجدِ محمدیہ'' کی تعمیر شروع کر دی۔ اور اسے مرکزِ علم و ادب بنا دیا۔ فوت ہوئے تو اسی
مسجد کے دامن میں دفن ہوئے۔ آج یہ بڑی مسجد مولانا محمد ارشد رانا صاحب کی زیرِ
خطابت ہے مگر

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں!

مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ:

سید ابوالحسن علی الہجویری داتا گنج بخش کے مزار پر انوار کے پہلو میں لاہور کی غالباً
سب سے پہلی مسجد ہے جو حضرت داتا کے روحانی فیضان سے ہمیشہ نمازیوں سے لبالب
بھری رہتی ہے۔ اس مسجد میں بڑے بڑے معروف خطیب آئے مگر پاکستان بننے کے
بعد کچھ عرصہ کے لیے مولانا محمد عمر اچھروی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی پنجابی تقاریر سے نہ صرف
اہل لاہور کو متاثر کیا بلکہ دوسرے شہروں سے جوق در جوق نمازی آتے اور آپ کی
تقاریر سنتے۔ مولانا پنجابی کے قادر الکلام خطیب تھے۔ وہ نہ صرف پنجابی کے مخصوص
الفاظ استعمال کرتے بلکہ بعض اوقات الفاظ گھڑتے۔ مجھے جب کبھی مولانا محمد بخش
مسلم مرحوم اور مولانا محمد شریف نوری مرحوم کے ساتھ ''دار المقیاس'' میں آپ کی ذاتی
مجالس میں بیٹھنے کا موقع ملتا تو پنجابی کے بے تکلف جملے سن کر ہم لوٹ پوٹ ہو
جاتے۔ مولانا محمد بخش مسلم مرحوم کو اپنی زبان دانی پر بڑا ناز تھا۔ مگر مولانا محمد عمر اچھروی
مرحوم کے محاورے سنتے تو نہ صرف عش عش کر اٹھتے بلکہ کئی بار رقص کرنے لگتے۔ مولانا

محمد عمر اچھروی صرف خطیب ہی نہیں تھے، زبردست مناظر تھے۔ شیعہ، دیوبندی
وہابی مناظر مولانا محمد عمر اچھروی کی للکار کے سامنے شکست کھا کر بھاگ جاتے۔
محمد عمر جس مجمع میں تقریر کرتے کئی کئی گھنٹے لوگوں کو ہلنے نہ دیتے۔ ہر شخص کی خواہش
ہوتی کہ مولانا اچھروی تقریر کرتے جائیں اور وہ سنتے جائیں۔

پھر چھیڑا "عمر" نے اپنا قصہ
لو آج کی رات بھی سو چکے ہم!

مولانا غلام دین رحمۃ اللہ علیہ (انجن شیڈ):

پاکستان کے قیام کے بعد مولانا غلام دین نے انجن شیڈ کے ایک ویرانے میں
خطبہ جمعہ دینا شروع کیا۔ ریلوے کے مزدور آپ کے سامعین ہوتے۔ آہستہ آہستہ
مجمع مزدوروں کے علاوہ عام لوگوں کا مجمع بن گیا۔ لاہور کے اہلِ ذوق جوق در جوق
آنے لگے۔ کھلا میدان لوگوں سے بھرنے لگا۔ دور دور سے لوگ پہنچنے لگے۔ مولانا
غلام دین مرحوم نہایت میٹھے انداز میں تقریر کرتے۔ وہ اپنی تقریروں کے بل بوتے پر
سارے ملک پر چھا گئے۔ دور دراز سے لوگ آتے اور آپ کو دعوت خطاب دیتے۔
مولانا کی کوششوں سے انجن شیڈ میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر ہوئی جس کے پہلو میں
آپ آرام فرما ہیں۔ آج یہ مسجد بڑی عمارت ہے مگر خاموش ہے۔ نہ ریلوے کے
انجنوں کا شور رہا نہ علماء کی تقریروں کا زور رہا!

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی:

اگرچہ بات اپنی ہے مگر "گفتہ آید در حدیث دیگراں" دہلی دروازے کے باہر
کوتوالی کے متصل ہمارے استاد مفسر قرآن مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی بنائی
ہوئی دو منزلہ مسجد ہے۔ جب ہم نے اس میں تقریر کا آغاز کیا پہلے تو رک رک کر، آہستہ
آہستہ، پھر قدم بقدم تقاریر کا آغاز کیا مگر ایک وقت آیا کہ یہ مسجد لاہور کے خطبات جمعہ

کا ایک اہم مقام بن گئی۔ لوگ قطار در قطار آتے۔ مسجد کا صحن بھر جاتا۔ چھت بھر جاتی۔
سامنے گھاس منڈی کا وسیع میدان بھر جاتا۔ پھر ساتھ کوتوالی کا احاطہ بھرا جانے لگا۔
یہی نہیں بلکہ لوگ دوسری مساجد میں جمعہ پڑھ کر سڑکوں پر آ کھڑے ہو کر تقریر سنتے۔
ما شاء اللہ الحمد للہ اس مسجد نے اہلِ ذوق کو کھینچ لیا۔ اہلِ محبت نے پسند کیا اور کئی سال
تک یہ مسجد تقریری ذوق کا لطف اٹھانے والوں کا مرکز بنی رہی۔ لاہور کے مقررین کی
بات چلتی تو اس مسجد کے خطیب (پیرزادہ اقبال احمد فاروقی) کا ذکر ضرور آتا۔

بات جب چھڑ گئی قیامت کی
قصہ پہنچا تیری جوانی تک

لاہور خطیبانِ اہلِ سنت کا گہوارہ:

ایک وقت آیا کہ پنجاب کے چوٹی کے خطیبوں نے لاہور کو اپنا مرکز خطابت بنا
لیا۔ لوہاری دروازے سے لے کر بھاٹی دروازے تک کا وسیع باغ سامعین سے لبالب
بھر جاتا اور پنجاب کے چیدہ چیدہ سنی علمائے کرام آتے اور تقاریر کرتے۔ صاحبزادہ
سید فیض الحسن آلو مہاروی، شیخ القرآن مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا محمد بخش مسلم،
مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا غلام دین انجن شیڈ، مولانا محمد عمر
اچھروی، مولانا محمد شریف نوری جیسے بلند پایہ مقرر خود بخود آتے اور تقریریں کرتے۔
ادھر لاہور کے لوگ بھی سارا سارا دن ان تقاریر سے مستفیض ہونے کے لیے دور دراز
سے آتے۔ یہ دور سنی خطیبوں کا ایک مثالی دور تھا جو بلا کسی دعوت، کرایہ یا نذرانے کے
عوام کے سامنے تقاریر کرتے تھے۔

مولانا نور محمد ایمن آبادی:

ان علمائے کرام کے سٹیج سے تھوڑا سا آگے جائیں تو پیر مکی کے مزار کے سامنے
ایک خوبصورت باغ آتا ہے جہاں ایک سوز خواں سنی عالمِ دین مولوی نور محمد ایمن

آبادی وعظ کیا کرتے تھے۔ ان کی مجلس وعظ میں خواتین کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ انہوں نے مستورات کو کھلی اجازت دے رکھی تھی وہ دورانِ تقریر گھر کے لیے ازار وغیرہ بنا سکتی تھیں۔ سویٹر بن سکتی تھیں، گھر کے تمام کام سرانجام دے سکتی تھیں۔ منے ... بچوں کو دودھ پلانا، انہیں کھلانا اور ان کو لوریاں دینے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ مولوی ... محمد ایمن آبادی ہرنی کا قصہ، جابر کے فرزندوں کی قربانی اور ان کا دوبارہ زندہ ہو... حضرت بلال پر مظالم کی داستان، شہدائے کربلا کی داستانِ غم سناتے جاتے اور ... میں توجہ سے وعظ سننے والی خواتین کو رلاتے جاتے۔

مولانا مودودی میدانِ خطابت میں:

لاہور کے اس خطاباتی زمانہ کے دوران عالمگیر کی بادشاہی مسجد میں مولانا غلام مرشد، سنہری مسجد کے خطیب اور دیوبندی مساجد کے ائمہ بالکل لاتعلق رہتے تھے۔ البتہ جماعت اسلامی کے سربراہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے علمائے اہل سنت کی اس مہم سے متاثر ہو کر اپنی خطاباتی تحریک کا آغاز کیا۔ وہ لاہور کے بڑے بڑے محلوں میں ''جماعت اسلامی'' کے اجتماع کرتے۔ لوگوں کو اپنے افکار سے آگاہ کرتے اور نوجوان طبقہ کو متاثر کرتے۔ جب سنی علماء اپنے پروگرام میں سست پڑ گئے تو مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھاٹی دروازہ کے باہر والے باغ میں ایک زبردست کانفرنس کی۔ یہ نواب آف کالاباغ کی گورنری کا زمانہ تھا۔ جماعت اسلامی کی کانفرنس میں گولی چلی۔ جماعت اسلامی کا ایک عالم دین اللہ بخش گولی کا نشانہ بنا۔ کانفرنس درہم برہم ہوگئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مولوی اللہ بخش کا قاتل آج تک نہیں پکڑا گیا!

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ:

اگر چہ لاہور کی گلیوں میں بڑے بڑے اہلِ علم کے ''آشیانے'' تھے مگر رام گلی کے ایک درویش صفت طبیب حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی مجالس نہیں بھولتیں۔ وہ علم

دوست انسان تھے۔ مریضوں کے علاوہ اہلِ علم بھی ان کے مطب میں موجود رہتے۔ وہ مریضوں کو دوائی دیتے مگر اہلِ علم کی خاطر ومدارات کرتے۔ آگے چل کر اسی حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کرنے کا پروگرام بنایا۔ یومِ رضا کے جلسوں میں مقتدر علماء اور خطباء کو دعوت خطاب دیتے اور لوگ جوق در جوق آتے۔ آپ نے اٹھارہ سو کتابیں شائع کر کے تقسیم کیں اور فاضلِ بریلوی کے افکار کو سارے برصغیر میں پھیلایا۔ یہ سلسلہ ابھی تک ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے زیرِ اہتمام جاری ہے۔

تحریکِ ختمِ نبوت:

پاکستان کے قیام کے چند سال بعد ''تحریکِ ختمِ نبوت'' چلی تو علمائے اہلِ سنّت نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دیوبندی علماء، وہابی مولوی، جماعت اسلامی کے دانشور اور شیعہ ذاکر پہلی بار لاہور شہر میں سنی علماء کی قیادت میں سامنے آئے۔ چونکہ یہ جماعتیں تحریک پاکستان کے خلاف تھیں۔ انہیں لوگ سننا تو کیا دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ''تحریکِ ختمِ نبوت'' کے دوران یہ لوگ سنیوں کے دامن میں لپٹ کر پاکستان میں پہلی بار دینی میدان میں آگئے۔ مولانا ابوالحسنات، مولانا عبدالحامد بدایونی، صاحبزادہ سید فیض الحسن اور مولانا احمد سعید کاظمی جیسے سنی علماء اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ مارشل لا لگا تو سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب ان دنوں پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ انہوں نے پنجاب اسمبلی سے نکل کر مسجد وزیر خان کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا۔ مارشل لا کے باوجود تین دن تک حکومت کے خلاف تقریر کرتے رہے اور کسی پولیس مین یا ملٹری کے جوان کو اپنے ہیڈ کوارٹر تک نہ آنے دیا۔ ان دنوں وزیر خان کی مسجد میں سنیوں کا مجمع دیدنی اور مولانا عبدالستار خان نیازی کی تقاریر شنیدنی ہوتیں۔ مولانا نیازی کو جب فوجی عدالت نے سزائے موت سنائی تو ان کی پیشانی پر فتح وکامرانی کی جھلک نمایاں تھی۔ اس تحریک میں ہزاروں سنی علمائے کرام نے قید و بند

کی صعوبتوں کو لبیک کہا تھا اور اکثر مارشل لاء کے فوجیوں کی گولیوں کے نشانہ بنے۔

چوک دالگراں کی ''مسجد دالگراں'' میں مفتی محمد حسین نعیمی مرحوم دارالعلوم نعیمیہ کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ وہ دارالعلوم کے ابتدائی ایام میں دالگراں کے چوک میں رات کے وقت جلسے کراتے۔ ملک کے بڑے بڑے علمائے کرام کو بلاتے۔ اس طرح لاہور کے لوگ رات بھر چوک دالگراں کے جلسوں میں تقاریر سنتے۔ مَیں نے ان جلسوں میں حضرت محدث کچھوچھوی، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا شاہ عارف اللہ قادری، مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا بشیر احمد کوٹلی لوہاراں، مولانا بخش مسلم، مولانا ابوالحسنات، مولانا غلام دین انجن شیڈ کو زوردار تقریریں کرتے سنا۔ مفتی محمد حسین نعیمی اپنے جلسوں میں اقتدار سے محروم سیاسی لیڈروں کو بھی بلاتے تھے۔ مَیں نے اسی سٹیج پر خان عبدالقیوم خان، نواب مشتاق احمد گورمانی، مولانا نیازی جیسے لیڈروں کو اس وقت سنا، جب انہیں اقتدار سے محروم کر کے دلفگار کر دیا گیا تھا۔ مولانا نعیمی نے جب اپنے دارالعلوم کی بنیاد رکھی تو بڑے بڑے قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کیں جس سے طلبہ کی قطاریں لگ گئیں۔ یہی دارالعلوم جامعہ نعیمیہ بن کر گڑھی شاہو آیا تو لاہور میں صف اول کی سنی درس گاہ بن گیا۔

جامعہ نعیمیہ کے جلسوں کی رونقیں:

مجھے زینت القراء قاری غلام رسول صاحب کی جلسوں میں خوش آوازی سے قرآن خوانی کرنا ابھی تک یاد ہے۔ مجھے مولانا الٰہی بخش صاحب کی تقریریں ابھی تک لطف دیتی ہیں۔ مجھے محمد اعظم چشتی مرحوم کی نعتیہ خوش آوازی ابھی تک کانوں میں گونجتی سنائی دیتی ہے۔ مجھے حضرت محدث اعظم کچھوچھوی کی گرجدار آواز کی گونج ابھی تک سنائی دیتی ہے۔ مجھے مولانا غلام محمد ترنم کی کڑکتی آواز ابھی تک خوش کرتی ہے۔ مجھے مولانا عبدالحامد بدایونی کی طرح دار تقریر ابھی تک مسرور کرتی ہے۔ مجھے مولانا یار فریدی کی سرائیکی میں تقریر کی شیرینی نہیں بھولتی۔ سید امانت علی شاہ چشتی کی مثنوی کانوں کو سکون بخشتا ہے۔ مجھے مولانا محمد شریف نوری کا تقریر کے دوران خوش آوازی سے پڑھا ہوا شعر پڑھنا ابھی تک سرور میں لے آتا ہے۔ مجھے سید محمود شاہ گجراتی کی تقریریں ابھی تک نہیں بھولیں۔ مجھے مولوی عبدالغفور ہزاروی کی تقریر کا انداز ابھی تک یاد ہے۔ مجھے صاحبزادہ فیض الحسن کے الفاظ کے موتی برسانا ابھی تک نہیں بھولے۔

لاہور کے جلسے:

''جماعت اصلاح المسلمین'' بازار تیزابیاں کشمیری بازار کے جلسے انفرادی شان رکھتے تھے جہاں ہمارا گروپ خود ہی تلاوت قرآن کرتا، خود ہی نعت پڑھتا، خود ہی تقریریں کرتا، خود ہی صلوٰۃ وسلام پڑھتا اور دعا کے بعد ہر شخص اپنی اپنی سائیکلوں پر اپنے اپنے گھر جا کر کھانا کھاتا۔ نہ دعوت، نہ کھانا، نہ کرایہ، نہ نذرانہ، اللہ اللہ خیر صلاّ! لوگوں کو ہمارا یہ انداز اچھا لگا۔ اور ہمیں لاہور کے ہر علاقہ سے دعوتیں آنے لگیں۔ مجھے اس زمانے کی نعت خوانوں کی مجالس ابھی تک یاد ہیں جو اہلِ محبت کو عشقِ رسول کے جذبے سے مالا مال کرتے تھے۔ محمد اعظم چشتی مرحوم ان کے استاد فضل الٰہی کی پارٹی، جان محمد امرتسری، جان محمد جانی، سرفراز پپا، بعد میں آنے والے ثناء اللہ بٹ، محمد علی ظہوری، محمد حسین نظامی، صوفی اللہ دتا اور مرغوب ہمدانی اور دوسرے نعت خوان حضور کی بارگاہ میں ہدیہ عقیدت پیش کرتے۔ آج سے چالیس سال پہلے ''ویلوں'' کا رواج نہیں تھا۔ ان نعت خوانوں کو تبرکات کا دوگنا حصہ ملتا تھا۔ کہیں کہیں چھپ چھپا کر ''خدمت'' کی جاتی تا کہ نعت خوان کا ''وقار'' مجروح نہ ہو۔

پیر حیدر شاہ کے موکل:

لاہور میں وعظ ونعت کی مجالس سے ہٹ کر علمائے دین کا ایک ایسا طبقہ بھی تھا جو شب بیداری میں اپنی مثال آپ تھے اور زہد وتقوٰی کو اختیار کیے ہوئے اپنے حجروں

میں ہی محدود رہتے تھے۔ اور لوگ ان کی دعاؤں کی تمنا میں ان کے حجروں
کے گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ دارالعلوم حزب الاحناف کو جانے والی گلی
کونے میں سید حیدر شاہ بخاری رہتے تھے۔ وہ تعویذات اور عملیات کے
تھے۔ ان کے اخراجات کو دیکھ کر بعض حضرات کہتے کہ شاہ صاحب کیمیا گر ہیں۔
زیرِ زمیں ایسے ایسے عملیات کرتے جس کا بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ اگر وہ کسی
سے کوئی چیز خریدتے تو ان کے روپے رات کو ان کے پاس واپس آجاتے۔
تھا کہ ان کے پاس بعض ایسے موکل ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ وہ اکثر ہندو سا
سے زیورات، ملبوسات اور دوسری ضروریات خریدتے۔ تحریکِ پاکستان
مسلمانوں نے ہندو دکانداروں سے سودا سلف لینا بند کر دیا مگر حیدر شاہ بخاری
سے ہی سودا سلف لیتے۔ مسلمانوں نے ان پر زور ڈالا اور اصرار کیا کہ آپ
دکانداروں سے زیورات و ملبوسات لیا کریں۔ یہاں تک کہ وہ چند ایک
دکانداروں کو ساتھ لے آئے۔ بخاری صاحب نے انہیں بتایا کہ ان کے موکل
روپیہ واپس لے آتے ہیں۔ مَیں کسی مسلمان کو نقصان پہنچانا پسند نہیں کرتا مگر
نے اصرار کیا۔ شاہ صاحب نے نوٹوں پر دستخط کرائے۔ دوسرے روز گمٹی بازار
بازار کے مسلمان دکانداروں سے خریداری کی۔ نوٹ دکانداروں کے حوالے
دستخط دکھائے مگر دوسرے روز وہ نوٹ شاہ صاحب کے گھر تھے۔ اس دکاندار نے
نوٹ سرہانے کے نیچے رکھے۔ رات کو اسے خواب آیا کہ کوئی شخص نوٹ اٹھائے
رہا ہے۔ صبح اٹھے تو واقعی نوٹ غائب تھے۔

عملیات کے ماہر علمائے کرام:

مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کو ہم نے کئی بار دیکھا کہ کوری ٹھیکریوں پر
حروف لکھتے۔ آگ میں دبانے کا کہتے اور گمشدہ افراد فوراً گھر آجاتے۔
دروازے کے اندر مولوی نیاز علی کی مسجد میں ایک صوفی کے پاس ایسے لوگ آتے

کے تالوں کی چابیاں گم ہو جاتیں تو صوفی صاحب دم کرتے۔ گھر پہنچنے سے پہلے مقفل
دروازے کھل جاتے۔ تیز بخار، واری کا بخار اور میعادی بخار کو تو ہم نے پیر برہان کے
مزار سے کنکریاں اٹھا کر باندھنے سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ وزیر خان کی مسجد کے
ساتھ مولوی تاج الدین کی مسجد میں جنات کا بسیرا تھا۔ صوفی اسمٰعیل کے پاس آسیب
زدہ لوگ آتے اور شفا پاتے۔ مزنگ کے ایک عالم دین کے ہاں جب بھی جانا ہوا،
دانوں سے یوں کھیلتے دکھائی دیتے جیسے تسبیح چلا رہے ہوں۔ ہمیں دیکھ کر کہتے بھاگ
جاؤ اب مولوی آگئے ہیں!

سابقہ پچاس سالہ لاہور کے شب و روز اس انداز سے آباد تھے۔ اس کے گلی
کوچے اہلِ ذکر کی محفلوں سے سرشار تھے۔ اس کی مسجدیں آباد تھیں، اسکی خانقاہیں
بارونق تھیں۔ اس کے مدرسے طالب علموں سے بھرے بھرے، اس کے جلسے پرہجوم مگر
پرامن تھے۔ اس کی محفلیں پرسکون تھیں۔ اس کے لوگ خوش خوش اور مطمئن تھے۔ لیکن
اب وہ زمانہ گزر گیا۔ وہ وقت گزر گیا، وہ شب و روز بیت گئے۔

؎ گزر گئی تیرے مستوں کی وہ بھی تیرہ شبی
نہ کہکشاں، نہ ثریا نہ خوشۂ عنبی

(''جہانِ رضا'' جون ۲۰۰۰ء)

آسمانِ اہلِ سُنّت سے ڈھلتے ہوئے سورجوں پر ایک نظر

مقدور ہو تو موت سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کیے؟

مجاہدِ ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی رحمۃ اللہ علیہ:

یکم مئی ۲۰۰۱ء کو زندگی سے روٹھ گئے اور ہم سے جدا ہو گئے۔ چار روز قبل آزاد کشمیر میرپور میں تاجدار بریلی کانفرنس میں صدر تھے زبردست تقریر کی۔ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اپنے گھر میانوالی آئے۔ تین دن کے بعد علی الصباح داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ و انا الیہ رٰجعون۔

مولانا نیازی بڑے باکمال انسان تھے۔ وہ تحریک پاکستان کے سپاہی تھے وہ قائداعظم کے فدائی تھے۔ وہ تحریک ختم نبوت کے لیڈر تھے۔ وہ پاکستان کے سیاسی اور دینی راہنماؤں میں صف اول کے راہنما تھے ان کی ساری زندگی ملکی حالات کی کشمکش میں گزری وہ ظالموں، جابروں اور بدعنوان حکمرانوں کو للکارتے رہے۔ وہ قید و بند ہی نہیں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے رہے۔ وہ سیاست کے خارزاروں سے گزر کر جب قصر وزارت میں قلمدانِ وزارت تک پہنچے تو دنیا زر پرستی کو زندگی کا اصول بنا بیٹھی تھی۔ جب اقتدار پسند طبقہ مال و دولت کو خدا جاننے لگا تھا۔ جب پاکستان کی دولت لوٹ کھسوٹ کے لیے مباح تھی اس وقت یہ مردِ مجاہد ان حالات میں بھی فقر و استغنا کے بوریا پر بیٹھا رہا۔ جب وہ اس دنیا سے گیا نہ مکان، نہ پلاٹ، نہ کارخانہ، نہ بینک بیلنس، فقیر اور درویش بن کر گیا۔

مولانا نیازی سے ہماری نیاز مندی تحریک ختم نبوت سے شروع ہوئی جب وہ

مسجد وزیر خان لاہور میں پاکستان کے پہلے مارشل لاء کے سامنے سینہ سپر تھے۔ وہ قادیانیت کی جھوٹی نبوت کو پائے استحقار سے ٹھکرا رہے تھے۔ ہم نے انہیں موت کی کال کوٹھری میں اس وقت دیکھا۔ جب موت ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اور تختۂ دار ان کو پکار رہا تھا۔ مگر:

وہ کہ سوزِ غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

مولانا نیازی موت کی وادی سے اذان دیتے ہوئے گزرے۔ وہ تختۂ دار کو سلام کرتے ہوئے گزرے وہ نواب آف کالاباغ کو کالی سیاست کا کالا بھوت کہا کرتے تھے۔ وہ ایوبی دور میں بغاوت کے چودہ مقدمات کو ٹھکراتے ہوئے گزرے ہم اس مجاہد ملت کو سلام کرتے اور ملاقات کرتے وقت قدم چوم لیتے۔

ایک وقت آیا کہ وہ ''مرکزی مجلس رضا'' کے سرپرست بنے۔ سعودی حکومت نے اعلیٰ حضرت کے ترجمہ قرآن ''کنزالایمان'' پر پابندی لگائی تو انہوں نے احتجاج کیا۔ کتاب لکھی۔ برطانیہ میں سعودی حکام سے اس پابندی پر تفصیلی گفتگو کی۔ اور اپنا موقف نہایت علمی انداز میں پیش کیا۔

ہم نے انہیں سیاسی میدان میں بھی دیکھا وہ جمعیۃ العلماء پاکستان کی اعلیٰ قیادت کے ستون تھے وہ قائد اہلسنت الشاہ احمد نورانی صدیقی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سارے پاکستان کا دورہ کرتے نظر آئے۔ انہوں نے کراچی سے لے کر پشاور تک سنیوں کو بیدار کیا متحد کیا۔ حجروں سے میدان سیاست میں لائے۔ پھر جب انتخابات آئے تو ان کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے امیدوار ہر صوبہ ہر ضلع ہر تحصیل میں منتخب ہوتے گئے۔

ان کی قیادت جب قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں پہنچی تو انہوں نے آئین سازی میں موثر کردار ادا کیا۔ مرزائیوں کو مرتد قرار دینے میں اہم کردار ادا کیا وہ ذوالفقار علی بھٹو کے سوشلزم کے طوفان کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح کھڑے نظر آئے

وہ نظام مصطفیٰ کی تحریک میں صف اول میں نظام مصطفیٰ کا پرچم بلند کیے دکھائی دیے۔

ہم نے انہیں جنرل ضیاء الحق کی آمریت کو للکارتے ہوئے دیکھا جب ان کے ہزاروں ساتھی اسلام آباد کے ہوٹلوں میں حکومتی دعوتوں پر ٹوٹ پڑے تھے۔ زکوٰۃ و خیرات کی چمک دمک کی وجہ سے ان کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ تن تنہا اپنے قائد [illegible] احمد نورانی کے پہلو میں کھڑے نظر آئے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو پکارتے رہے واپس بلاتے رہے۔ سمجھاتے رہے مگر جب جلسہ ختم ہوجاتا ہے تو خطیب کی آواز کون سنتا ہے۔

ہم نے انہیں اقتدار کی کرسی پر بھی دیکھا۔ وہ فقیر بے نوا کی طرح ایوان وزارت میں بیٹھتے۔ ہم نے ان پر انعام واکرام کی بارشیں ہوتی دیکھیں مگر وہ اپنا دامن بچا [illegible] ایک طرف ہوجاتے۔ ہم نے انہیں اس میلے میں تن تنہا دیکھا۔ جب ہر شخص لوٹ کھسوٹ کو اپنا حق سمجھتا تھا۔ ہم نے انہیں پلاٹوں۔ کوٹھیوں کی الاٹمنٹ، قرضوں کی بندربانٹ۔ کارخانوں کی مفت ملکیت کے میلے سے علیٰحدہ کھڑے دیکھا۔ وہ وزارت میں رہ کر فقر وفاقہ کی چادر سمیٹے ہوئے باہر نکلتے نظر آئے۔

ہم ان کے حالات زندگی نہیں لکھ سکتے۔ مگر ہم نے ایسے شخص کو سفر آخرت کرتے دیکھا تو برملا کہا۔ شادم از زندگی خویش کہ تنہا رفتم!

اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمتیں برسائے۔ اللہ تعالیٰ ان کے مرقد کو اپنے نور سے بھر دے اللہ تعالیٰ ان کی روح کو پاکستان میں نظام مصطفیٰ کے نفاذ کی عملی صورت میں دیکھنے کی توفیق دے۔ نور اللہ مرقدہ.............. طاب اللہ ثراہ.......... وجعل قبرہ روضۃ من الریاض الجنۃ۔

مولانا خدا بخش اظہر:

شجاع آباد میں ۲ مئی ۲۰۰۱ کو موت کو لبیک کہتے ہوئے چلے گئے وہ ایک بلند پایہ سنی عالم دین تھے۔ وہ ایک خوش گفتار خطیب تھے وہ منجھے ہوئے مدرس تھے۔ وہ قابل معلم تھے۔ وہ اعلیٰ منتظم تھے۔ انہوں نے شجاع آباد میں اس وقت ایک دینی دارالعلوم کی

آباد رکھی۔ جب اس علاقہ میں دیوبندیوں کا غلبہ تھا۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی مجلس احرار کے قائد تھے اعلیٰ قسم کے خطیب تھے۔ عام دیوبندی ہی نہیں سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی محمد علی جالندھری، شورش کاشمیری، شیخ حسام الدین امرتسری جیسے شعلہ بیان احراری پوری ملت دیوبند کے ساتھ شجاع آباد اور اس کے مضافات پر چھائے ہوئے تھے۔ مولانا خدا بخش اظہر نے ان حالات میں بے سروسامانی کے عالم میں شجاع آباد کے قصبہ میں اہل سنت کا علم بلند کیا۔ محنت کی۔ مشقت کی۔ تدریس کی۔ تعلیم کو پھیلایا۔ عشق رسول کا پیغام دینا شروع کیا۔ فقیرانہ انداز سے کام کیا۔ چند برسوں میں سارا علاقہ اپنے رسول کی محبت کی تلاش میں آپ کے اردگرد جمع ہونے لگا۔ دیوبندیوں کا زور ٹوٹ گیا اور مولانا اظہر کا دارالعلوم ایک چشمہ علم وفضل بن کر علاقہ کو سیراب کرنے لگا۔

آج وہ ہم سے جدا ہوگئے ہیں مگر ان کی نیک اولاد (علامہ محمد اقبال صاحب اظہری جمعیۃ العلماء پاکستان ہمارے خصوصی دوست ہیں) ان کا دارالعلوم، ان کے شاگرد، ان کے عقیدت مند، ان کے ہمعصر علماء ان کی یادوں کے امین ہیں۔

ع آسماں تیری لحد پر نورافشانی کرے

مولانا غلام علی اشرفی اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ:

مولانا غلام علی اشرفی اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۲۰۰۰-۵-۱۶) کو ہم سے بچھڑے ایک سال ہوگیا۔ آپ کا سالانہ عرس بھی ہوگیا ہمارے برادر عزیز علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی کراچی سے اوکاڑا آئے اور حضرت مولانا غلام علی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات پر بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ اس سال وہ ''یادگار غلام علی اوکاڑوی'' شائع نہیں کر سکے۔ ورنہ ان کی درخشاں تحریریں ''منم غلام علی وعلی امام من است!'' کے عنوان سے ہمارے سامنے آتیں۔

مولانا غلام علی اشرفی اوکاڑوی (جنہیں ہم ساری زندگی مدظلہ لکھتے آئے ہیں آج ''رحمۃ اللہ علیہ'' لکھنا پڑا) ایک زبردست عالم دین تھے۔ وہ بیک وقت خطیب، معلم، مدرس، سیاست دان اور منتظم تھے۔ ان تمام اوصاف علیہ کے ساتھ ساتھ ہمارے نہایت ہی

شفیق دوست تھے ہم نے ان کے سامنے زانوئے ادب تو تہ نہیں کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے
کہ ہمارے ذہن وبیان میں جو کچھ ہے وہ حضرت مولانا غلام علی اوکاڑوی کے خرمن علم
وفضل کی خوشہ چینی ہے۔ ہمیں آپ کی نیاز مندی کا شرف تشکیل پاکستان سے بہت
پہلے سے حاصل ہے۔ ہارون آباد (ریاست بہاول پور) میں ایک عظیم الشان جلسہ تھا
ان کی تقریر نے مجمع کو لوٹ لیا۔ اور اس دن سے ہم ان کے ''غلام بے دام'' بن گئے۔
ساری عمر ان کی شفقتیں ابر محبت بن کر برستی رہیں۔ ہماری ذاتی لائبریری میں ایک ایسی
کتاب تھی جسے ہم علمائے کرام کی نظر شوق سے چھپائے رکھتے تھے۔ مولانا غلام علی اشرفی
کو ہماری نیاز مندی پر بڑا ناز تھا۔ اوکاڑا سے دوڑے دوڑے لاہور آئے کتاب طلب
کی ہم نے عرض کی۔ جان من! ''جان خواہی حاضر است۔ کتاب خواہی سخنے درمیان
است'' بڑے مایوس ہوئے، بڑے ناراض ہوئے، بڑے غضبناک ہوئے مگر ہم یہی
کہتے رہے۔ ''جان خواہی حاضر است!'' فرمانے لگے اچھا جان اپنے جسم ناتواں میں
رکھو۔ کتاب دو۔ تمہارے حجرے میں بیٹھ کر پڑھ لوں گا۔ میں سلام کرتا ہوں مولانا
غلام علی کی کتاب بینی کو۔ وہ ساری رات جاگتے رہے۔ کتاب پڑھتے رہے۔ نماز فجر
کے بعد فرمانے لگے۔ جو ''کستوری'' تم نے سنبھال کر رکھی تھی وہ میرے سینے میں آگئی
ہے پھر وہ صفحے کے صفحے اور ہیروں کے ہیرے سناتے گئے۔ اور کتاب مجھے تھماتے
ہوئے اوکاڑا چلے گئے۔

مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخی کتاب ''تقدیس الوکیل عن توہین الرشید
والخلیل'' کو جب از سر نو مرتب کیا گیا تو ہم نے اس پر ایک مقدمہ لکھا۔ چھپی تو مولانا
غلام علی مرحوم مقدمہ اور کتاب پڑھ کر لاہور آئے۔ منہ چوما اور ایک سو روپیہ (آج کا
دس ہزار روپیہ) انعام دیا انگلی پکڑی۔ حجرے سے باہر نکالا اور حضرت سید علامہ ابو
البرکات کے پاس لے گئے اور مرکزی انجمن حزب الاحناف کے دامن میں ''مکتبہ
نبویہ'' کی بنیاد رکھ کر اوکاڑا چلے گئے اس مکتبہ سے متعدد ایسی کتابیں چھپ چکی ہیں جو

کسی کو دیکھنے کے لیے بھی نہیں ملتی تھیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب ''تکمیل الایمان فارسی'' کا ہم نے
اردو ترجمہ کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ فرمانے لگے دیباچہ میں لکھوں گا۔ دیباچہ کیا لکھا۔
خوش کر دیا۔ جب ہم نے پانچ سو روپیہ نذرانہ پیش کیا۔ تو یہ کہہ کر واپس کر دیا۔ کہ:

''دل وجان برتو فدایت کنم''۔

زندگی کے آخری ایام میں وہ بیماریوں سے لڑتے رہے۔ ڈاکٹروں، طبیبوں کی
نازبرداریاں کرتے رہے۔ مگر اپنے عزم اور جذبہ سے جلسوں میں شرکت بھی کرتے۔
تقریر بھی کرتے، تنقید بھی کرتے، سفر بھی کرتے۔ عمرہ بھی کرتے، حج بھی کرتے مگر
وقت نکال کر مکتبہ نبویہ میں ضرور آتے۔ ''جہان رضا'' کی تحریروں پر اپنی پسندیدگی کا
اظہار کرتے حوصلہ افزائی فرماتے بعض موضوعات پر لکھنے کو کہتے۔ اور فرماتے ''جہان
رضا'' جب جاتا ہے الف سے ی تک پڑھتا ہوں۔ اور خوش ہوتا ہوں۔ تاثرات اس
لیے نہیں لکھتا کہ کہیں تم ''نفاست ناموں'' میں نہ چھاپ دو۔

جانے سے چند روز پہلے لاہور آئے۔ مکتبہ نبویہ میں تشریف لائے۔ عربی کے
چند اشعار سنائے ان کی تشریح کی۔ اور دل خوش کر دیا پھر حضرت علامہ سید ابوالبرکات
اور سید محمود احمد رضوی رحمۃ اللہ علیہما کے مزارات پر فاتحہ پڑھ کر دونوں کو مخاطب کر کے
کہنے لگے۔ ''میں آرہا ہوں۔ میں آپ کے پاس آرہا ہوں''۔ چار دن بعد واقعی مولانا
غلام علی اوکاڑوی ہم سے جدا ہو گئے۔ اور اپنے دوستوں سے جا ملے۔

انا للہ و انا الیہ راجعون

(''جہان رضا'' مئی، جون ۲۰۰۱ء)

مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خاں نیازی نوراللہ مرقدہٗ

(م:۲۰۰۱-۵-۲)

مجاہد ملت مولانا محمد عبدالستار خان نیازی ایک مجاہد سیاست دان اور بلند پایہ عالم دین تھے۔ ان کی رحلت پر ملک بھر کے اخبارات، رسائل اور ذرائع ابلاغ نے بہت کچھ لکھا۔ خصوصی نمبر شائع کیے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اجلاس ہوئے۔ سیاسی اور مذہبی راہنماؤں نے ان کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ علمائے اہلسنت نے ملک کے گوشے گوشے میں ان کے لیے تعزیتی اجلاس منعقد کیئے۔ قرآن خوانی کی گئی، دعائے مغفرت کے لیے مجالس قائم کیں۔ اور حق یہ ہے کہ ان کے عقیدت مندوں نے اشکبار آنکھوں سے جس انداز میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا وہ شائد ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔

آج کی اس مجلس میں ہم مجاہد ملت کی زندگی کے شب و روز، آپ کے سیاسی سفر کے واقعات اور آپ کی دینی خدمات پر روشنی نہیں ڈالیں گے۔ کیونکہ ان موضوعات پر اخبارات میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہم ان کی زندگی کے بعض مشاہداتی واقعات کی یادوں کو تازہ کریں گے جو اگرچہ واقعات کے لحاظ سے غیر سیاسی ہیں۔ غیر اہم ہیں۔ چھوٹے ہیں مگر بڑے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا نیازی سے ہماری نیازمندی کا آغاز پاکستان میں پہلی تحریک ختم نبوت (۱۹۵۲ء-۱۹۵۳ء) کے ہنگاموں سے ہوتا ہے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب لاہور کے گلی کوچوں میں فوجی دندنا رہے تھے اور سارا لاہور فوجیوں کے بوٹوں سے کچلا جا رہا تھا بایں ہمہ کسی فوجی یا سپاہی کو اتنی جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ اندرون شہر

کی دروازے کے اندر وردی پہن کر داخل ہو سکے۔ سارا قدیم لاہور مولانا عبدالستار خان نیازی کی کمانڈ میں تھا۔ وہ مسجد وزیر خاں (لاہور کے عین وسط میں) مورچہ سنبھالے بیٹھے تھے۔ اور ملک کے تقریباً تمام نامور علمائے کرام گرفتار ہو چکے تھے۔ تحریک ختم نبوت کی مجلس عمل کے سارے اراکین جیل میں پابند سلاسل تھے۔ مولانا نیازی ان دنوں پنجاب اسمبلی کے ایم ایل اے (ممبر آف لیجسبلیٹو اسمبلی) تھے انہوں نے پنجاب اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف ایک بھرپور تقریر کی اور حکومت وقت کو مرزائیوں کی اندھی حمایت کرنے پر للکارا۔ پھر دوسرے دن مسجد وزیر خان کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا کر تحریک ختم نبوت کی کمان سنبھال لی۔

ہم جب پہلے دن مسجد وزیر خان میں داخل ہوئے تو مسجد عاشقان رسول سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ اور مولانا نیازی گرج رہے تھے۔ ہمیں آج تک وہ الفاظ یاد ہیں۔ جن کا زور اور جوش ہمارے دل و دماغ کو روشن رکھتا ہے آپ نے فرمایا:

''یہ پاکستانی مجاہدین کی چھاونی ہے یہ غازیوں کی لشکر گاہ ہے یہ شیروں کی کچھار ہے۔ یہ عقابوں کا نشیمن ہے۔ یہ بہادروں کی سرزمین ہے یہ عاشقان رسول کی تربیت گاہ ہے۔ یہ محمد بن قاسم کے مجاہدوں کا کیمپ ہے۔ آج اس ملک پر محمد شاہ رنگیلے کی اولاد قابض ہو گئی ہے آج اقتدار کی کرسیوں پر اینگلو محمڈن نوابوں کے بیٹے بیٹھے ہیں۔ آج یزید کے جانشین لشکر حسین پر گولیاں برسا رہے ہیں''۔

ان دنوں لاہور کی فوجوں کی کمانڈ جنرل اعظم کے ہاتھ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور کے علاوہ دوسرے شہروں سے علماء و مشائخ ان کے ہزاروں مرید، حافظانِ قرآن گلے میں حمائلیں ڈالے لاہور ریلوے اسٹیشن سے نکل کر لنڈے بازار سے ہوتے ہوئے مسجد وزیر خان کا رخ کرتے تھے۔ ہم نے ان شریف لوگوں پر کئی بار گولیوں کی بارش ہوتے دیکھی۔ گلے میں لٹکتے ہوئے قرآن زمین پر گرتے دیکھے۔ ختم نبوت کے پروانوں کے لاشے خاک و خون میں تڑپتے دیکھے، ہم نے کئی بار دہلی دروازے کے

باہر کوتوالی کے سامنے ہزاروں لوگوں کو زبردست مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ شہیدوں کی لاشوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے تھے۔ کئی بار ہم خود بھی ان مظاہروں میں حصہ لے کر گولیوں کی زد سے بچتے رہے۔

ہم دل شکستہ لوگ۔ دلفگار لوگ یہ مناظر دیکھتے تو آنکھوں سے آنسو بہ جاتے۔ لاہور کی سرزمین میں یہ پہلا جبر اور تشدد تھا جو مسلمان فوجیوں کے ہاتھوں مسلمانوں پر روا رکھا گیا پاکستان بننے کے بعد یہ پہلا موقع تھا۔ کہ ہم نے مسلمان فوج کے ہاتھوں مسلمانوں کو قتل ہوتے دیکھا پھر وہ مسلمان جو اپنے آقا و مولا کی ختم نبوت کے تحفظ کے لیے باہر آ گئے تھے۔ ہم شکستہ جان ہو کر مولانا نیازی کے پاس مسجد وزیر خان میں پہنچے۔ وہ تمام حالات سے باخبر تھے کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ لیکن ہمیں غمزدہ دیکھ کر کہتے ''فکر نہ کرو یہ جنرل اعظم نہیں یہ خر اعظم ہے جو دولتیاں جھاڑ رہا ہے۔ ایک وقت آنے والا ہے کہ ختم نبوت پر قربان ہونے والوں کا خون رنگ لائے گا''۔

ہم نے مسجد وزیر خان کے دروازے کے سامنے وہ نظارہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا جب لاہور کا ڈی ایس پی فردوس شاہ بیس باوردی سپاہیوں کو لے کر مولانا نیازی کو گرفتار کرنے آ گیا لوگوں نے اسے مسجد وزیر خان کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر للکارا اور آن کی آن میں اس کو قتل کر کے زمین پر پھینک دیا۔ ہم نے اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں کو تنگ گلیوں میں بھاگتے ہوئے دیکھا لوگ ان کے پیچھے ان کی وردیوں کو کھینچ کر گھسیٹ رہے تھے۔ اور وہ جان بچانے کے لیے تنگ و تاریک گھروں میں پناہ لے رہے تھے۔

ہم ان دنوں سٹی کوتوالی کے متصل اپنے استاد مولانا نبی بخش حلوائی کی مسجد میں رہتے تھے۔ ہم نے مسجد کی چھت پر کھڑے کھڑے فردوس شاہ کی بے گور و کفن لاش کو دیکھا۔ وہ بہت بڑا پولیس آفیسر تھا گجرات کا رہنے والا تھا۔ مگر اس کی لاش کو کوئی نہلانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ آخر تھانے کے ماشکی نے مشک سے اس کی لاش پر پانی

اور اسے گاڑی میں رکھ کر گجرات لے گئے خسر الدنیا و الاخرۃ۔

مارشل لاء حکام کی فوجی عدالت نے مولانا نیازی کو سزائے موت کا حکم سنایا یہ ایک نہایت ہی سخت سزا تھی۔ سارے ملک میں صف ماتم بچھ گئی۔ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے اور احتجاجی مظاہرے ہونے لگے ہمارا ان دنوں پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کی کوٹھی میں آنا جانا تھا۔ جہاں ہمیں پنجاب کابینہ کے وزراء اور ایم ایل اے حضرت سے ملنے کا موقع ملتا تھا۔ وہاں یہی باتیں ہوتیں ''نیازی پھانسی لگ گیا۔ نیازی تختہ دار پر آ گیا، نیازی مارا گیا یا نیازی گیا! نیازی گیا!'' یہ لوگ حکومت کے اساتین تھے اسمبلی کے ممبر تھے ہم ان کی باتوں کو درست مانتے تھے۔ دل بیٹھ جاتا تھا۔ راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی تھیں جہاں جاتے یہی باتیں سنتے۔ دولتانہ وزارت میں سید علی حسین گردیزی ہمارے بڑے مہربان وزیر تھے۔ نیازی صاحب کے دوست تھے۔ ہم نے انہیں کئی دفعہ اس خبر پر روتے دیکھا ان کا ایک عزیز لاہور میں سپرنٹنڈیٹ جیل تھا، ہم چار دوست تھے جو نیازی صاحب کو موت سے پہلے انھیں دیکھنا چاہتے تھے۔ گردیزی صاحب نے ہماری التجا پر فون اٹھایا اور سپرنٹنڈیٹ جیل کو کہا کہ ان چار لڑکوں کی نیازی صاحب سے ملاقات کراؤ۔ ہم جیل پہنچے، ان دنوں جیل شادماں کالونی میں تھی۔ نیازی صاحب کال کوٹھری میں قیام فرما تھے۔ ہم کئی بار انہیں مسجد وزیر خان میں مل چکے تھے۔ ہمیں پریشان دیکھ کر قریب بلایا سر پر ہاتھ رکھا۔ اور فرمانے لگے۔ ''فکر نہ کرو۔ مجھے کوئی پھانسی نہیں لگا سکتا۔ یہ میرے کپڑے دیکھو۔ نیازی صاحب نے قیدیوں کا ایک دھاری دار کرتہ پہنا ہوا تھا۔ جو ان کے بدن پر پورا نہیں آتا تھا آدھا پیٹ ننگا تھا آدھے بازو ننگے تھے۔ ان کا پاجامہ ٹخنوں تک تھا۔ ہمیں کھڑے دیکھا تو کہنے لگے جن بزدلوں کے کپڑے میرے جسم پر پورے نہیں آتے ان کی پھانسی کا پھندا میرے گلے میں پورا نہیں آئے گا۔ جاؤ! پروا نہ کرو! یہ مجھے تختہ دار پر نہیں لے جا سکیں گے''۔

کئی سال گزرے ایک دعوت میں ہم نے دیکھا کہ ایک ہی میز پر مولانا نیازی، مولانا مودودی اور جنرل (ریٹائرڈ) اعظم کھانا کھارہے ہیں ہم نے خوشی کا نعرہ لگایا اور کہا: ''نیازی اور مودودی کی موت کا فرشتہ آج ان کے ساتھ کھانا کھا رہا ہے''۔

نواب آف کالاباغ میانوالی کے نواب تھے۔ سوءِ اتفاق سے وہ مغربی پاکستان کے گورنر بن کر گورنر ہاؤس میں آبیٹھے ان کی ایمانداری اور مظالم کی داستانیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ نواب آف کالاباغ جبر و استبداد کا کوہِ گران تھے۔ کسی کو معاف نہ کرتے ساری نوکرشاہی ان کے سامنے لرزاں لرزاں رہتی تھی۔ سارے سیاست دان ان کے نام سے ڈرتے تھے اس نے نورے جیسے کئی قاتل غنڈے پال رکھے تھے۔ ان غنڈوں سے قبرستانوں میں مردے بھی کانپ جاتے تھے۔ ان پالتو غنڈوں سے اس نے کئی بے گناہ لوگوں کو قتل کرایا کئی صحافی۔ سیاسی لیڈر۔ کئی زمیندار موت کی وادی میں جا چکے تھے۔ کوئی زبان، کوئی قلم کوئی سیاستدان اس کے ڈر سے دم نہیں مارتا تھا۔ ان دنوں جسٹس کیانی اپنی تقریر میں کہا کرتے تھے کہ پہلے لوگ ''سبز باغ'' دکھایا کرتے تھے۔ اب ''کالاباغ'' دکھاتے ہیں۔ مگر مولانا نیازی اس سفاک گورنر کی بادشاہی میں جلسہ عام میں تقریر کرتے تو اسے ''کالے باغ کا کالا بھوت'' کہہ کر للکارتے تھے۔

نواب آف کالاباغ نے لاہور کے کئی قاتل غنڈے مولانا نیازی کے پیچھے لگائے ہوئے تھے آپ لکشمی چوک میں ایک تانگے پر سوار کہیں جارہے تھے۔ تو غنڈوں نے آپ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ اللہ نے اپنے خاص فضل سے مولانا کی جان بچالی۔ مگر اس واقعہ کے بعد بھی مولانا نیازی نے سر نہیں جھکایا کہ

کٹ سکتا ہے سر خوددار کا پر جھک نہیں سکتا!

ہم نے اس غنڈے کو جس نے مولانا نیازی پر قاتلانہ حملہ کیا تھا آخری دنوں میں کینسر کی بیماری میں ایک عرصہ تک تڑپتے اور سسک سسک کر مرتے دیکھا۔ جب اس کا جنازہ اٹھا۔ تو ہر شخص اس کی نفرت آمیز زندگی پر گفتگو کرتا تھا۔

مولانا نیازی کی عظمت ہر اس شخص کے دل میں موجود رہی جو ظلم کے مقابلہ میں ان کے کردار کو بہ نظر تحسین دیکھتا تھا۔ ہم نے میر علی احمد خاں تالپور وزیر دفاع پاکستان اور میر رسول بخش خاں تالپور گورنر سندھ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا جب وہ مولانا نیازی کو ملتے پہلے پاؤں کو ہاتھ لگاتے پھر گلے ملتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دونوں بھائی برسر اقتدار تھے ہم نے مولانا عبدالستار خان نیازی کو مولانا الشاہ احمد نورانی صدیقی صاحب کی رفاقت میں سارے پاکستان کا دورہ کرتے دیکھا۔ لوگ ان دونوں راہنماؤں پر قربان ہوئے جاتے تھے۔ علماء مشائخ۔ پیرزادوں اور نظام مصطفیٰ سے محبت رکھنے والوں کا ایک جم غفیر ان کے اردگرد ہوتا۔ یہ دونوں سنی راہنما جس شہر میں جاتے تھے۔ جس قصبہ اور قریہ میں قدم رکھتے، لوگ آنکھیں فرش راہ کرتے۔ سنی کانفرنس ملتان ہو یا میلاد کانفرنس رائے ونڈ مولانا نیازی اور مولانا نورانی کی قیادت پر سنیوں کا اعتماد دیدنی تھا آج ہزاروں نہیں لاکھوں لوگ گواہ ہیں۔ کہ ان کانفرنسوں میں علماء اہلسنت۔ مشائخ عظام، خادمان جمعیۃ العلماء پاکستان اور جان نثاران نظام مصطفیٰ پروانہ واران شمعوں کے گرد اکٹھے تھے۔ حالانکہ یہ جنرل ضیاء کی آمریت کا زمانہ تھا۔ جہاں مخالفین پر کوڑے اور ہم نواؤں پر انعام و اکرام کی بارشیں برستی تھیں مگر نیازی اور نورانی آمریت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صدر ضیاء کو وقت کا ''ابن زیاد'' کہا کرتے تھے۔ جنرل ضیاء اپنے دور آمریت میں نہ نیازی کو دبا سکا۔ نہ نورانی کو جھکا سکا

ہم نے سابقہ سطور میں مولانا نیازی کی زندگی کے وہ واقعات بیان کیے ہیں جہاں وہ ''اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر'' نظر آتے ہیں۔ مگر اب ہم وہ یادیں تازہ کریں گے جس میں ''اگر ہو صلح مثال غزال تاتاری'' دکھائی دیتے ہیں۔

حضرت مولانا نیازی مجلسی زندگی میں بڑے خوش گفتار اور بڑے ہی شفیق و حلیم تھے۔ تلخ اعتراض کا جواب خوشگوار انداز میں دیتے تھے طعنہ زنی کو خاطر میں نہ لاتے اور ''با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا'' کا رویہ اختیار کرتے تھے۔ علما اور طلبہ میں بیٹھتے

تو نہایت ادب اور شفقت فرماتے فقیروں غریبوں سے ملتے تو سراپا عجز و نیاز بن جاتے

یہ روایت مولانا عبدالستار خاں نیازی کے حلقوں میں بلاخوف تردید چلتی ہے کہ لاہور کے ''چار نوجوانوں'' نے عہد کیا تھا۔ کہ جب تک پاکستان میں اسلامی قانون (نظام مصطفی) نافذ نہیں ہوگا۔ وہ شادی نہیں کریں گے۔ یہ چاروں نوجوان اس میدان میں دن رات کوشاں رہے۔ یہ چار نوجوان مولانا عبدالستار خان نیازی، حکیم محمد انور بابری، م ش (میاں محمد شفیع کالم نگار نوائے وقت) اور مولانا ابراہیم علی چشتی (فرزند ارجمند مولانا محرم علی چشتی) تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ حکیم محمد انور بابری اور م ش نے تو شادیاں کرلیں۔ مگر مولانا ابراہیم علی چشتی اور مولانا نیازی اپنے عہد پر قائم بھی رہے اور تادم آخر پاک باز بھی رہے۔

پچھلے دنوں قاری زوار بہادر صاحب سیکرٹری جمعیۃ العلماء پاکستان نے مولانا نیازی کی یاد میں ایک تعزیتی جلسہ کرایا جس میں تمام سیاسی جماعتوں کے راہنماؤں کو دعوت خطاب دی گئی تھی۔ جماعت اسلامی کے لیاقت بلوچ صاحب نے اپنی تقریر میں حضرت نیازی صاحب کی سیاسی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کیا مگر تقریر کے آخر میں نیازی صاحب کے متعلق ایک لطیفہ سنایا۔

آپ نے بتایا کہ پچھلے دنوں اسلام آباد میں مختلف سیاسی راہنماؤں کی ایک میٹنگ تھی مسلم لیگ کے شیخ رشید آگے بڑھے اور نیازی صاحب کو گلے ملے۔ مجمع میں ایک منچلے نے آوازہ کسا! دیکھو! دو بوڑھے کنوارے آپس میں گلے مل رہے ہیں! شیخ رشید تو کھسیانے ہوگئے مگر مولانا نیازی نے شیخ رشید کو کہا: ''بھیڑا نہ پوا سیں انہاں رناں (رن مریدوں) کولوں چنگے ہاں (رشید! شرماؤ نہیں ہم ان رن مریدوں سے اچھے ہیں)

آج سے تیس سال قبل موچی دروازے کے باغ میں ایک جلسہ تھا بڑے بڑے لیڈر تقاریر کرنے آئے۔ مولانا نیازی نے اتنی زبردست تقریر کی اور حکومت وقت کے خلاف اتنی تلخ بیانی کی کہ ہر ایک کو خدشہ تھا۔ کہ وہ کل ہی پکڑے جائیں گے۔ چاہنے

لگے تو ماہنامہ ''احوال و آثار'' لاہور کے مدیر عبداللہ بٹ کہنے لگے۔ نیازی صاحب! اتنی سخت تقریر! مارے جائیں گے۔ فرمانے لگے میں مارا گیا تو مجھے کوئی رونے والا نہیں۔ مجھے کیا ڈر۔ ڈرتے تو وہ ہیں جو بیوی بچوں کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ''عبداللہ بٹ کہنے لگا۔ نہ شادی ہوئی۔ نہ بیوی آئی۔ نہ بچہ ہوا! بر چشم قلندر آپ کو کس کا ڈر ہے! اللہ اللہ خیر صلا۔

ہم نے مولانا نیازی کو فقیری میں دیکھا۔ جب وہ لکشمی چوک کے چوبارے میں رہتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو امیری میں دیکھا جب وہ اچکن اور طرہ دار پگڑی کے ساتھ لوگوں میں جاتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو غنڈوں کے گھیرے میں دیکھا جب وہ مردانہ وار بچ نکلتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو میانوالی کے پتھر دل لوگوں کے انتخابی معرکوں میں دیکھا جب وہ کالا باغی نوابوں اور روکھڑیوں کے مقابلہ میں کھڑے ہوتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو علمائے اہلسنت کے مجمعوں میں دیکھا جہاں وہ گل سرسبد دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو پنجاب اسمبلی میں اپوزیشن کی سیٹ پر دیکھا جب وہ اقتدار نشینوں کو للکارا کرتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو تحریک ختم نبوت کے دوران مسجد وزیر خان میں دیکھا جب وہ مارشل لا حکام کو اپنے جوتے کی ٹھوکر پر رکھا کرتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو، اقتدار کی کرسی پر دیکھا جہاں امیری میں فقیری کی شان نظر آتے تھے۔ ہم نے مولانا نیازی کو موت کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے دیکھا۔ جہاں اقبال کے شعر کی تصویر نظر آئے

نشانِ مرد مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم بر لب اوست!

(''جہانِ رضا'' جولائی ۲۰۰۱ء)

(''ضیائے حرم، لاہور'' جولائی ۲۰۰۱ء)

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ (م ۹۹-۱۱-۱۷)

(اعتقادی اور فکری خدمات - افکار رضا کی روشنی میں)

مرکزی مجلس رضا پاکستان کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری (م ۱۹۹۹ء) نے امام اہلسنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی کے نظریات کی اشاعت میں جس مستعدی اور مسلسل حکمتِ عملی سے کام لیا اس کی مثال برصغیر پاک و ہند میں نہیں ملتی آپ کی اس بے مثال جدوجہد کو علمائے کرام اور مشائخ عظام نے بھرپور انداز میں سراہا اپنے تو اپنے فاضل بریلوی کے نظریات سے اختلاف رکھنے والے دانشوروں نے بھی ہدیہ تحسین پیش کیا۔ آپ کی ان خدمات کی تفصیلات پاک و ہند کے اخبارات، میگزین، ماہناموں اور سابقہ دو عشروں میں چھپنے والی بے شمار کتابوں کے دیباچوں میں ملتی ہیں۔ ماہنامہ جہانِ رضا لاہور کے صفحات خصوصی طور پر حکیم اہلسنت کی علمی اور اعتقادی خدمات پر روشنی ڈالتے رہے ہیں۔

ہم چونکہ "مرکزی مجلس رضا پاکستان" کے قیام سے بہت پہلے حکیم صاحب کی مجالس میں آتے جاتے رہے ہیں اندریں حالات ہم ان مشاہداتی واقعات پر ہی روشنی ڈالیں گے جن سے بانی مرکزی مجلس رضا کی علمی اور اعتقادی خدمات کی ایک جھلک سامنے آجائے۔ ایک زمانہ تھا، جب حکیم محمد موسیٰ امرتسری رام گلی لاہور میں ایک مختصر سا مطب کرتے تھے۔ آپ کو دینی کتابوں کے مطالعہ سے بڑی دلچسپی تھی اور بعض ملکی رسائل میں آپ کے مضامین بھی چھپتے رہتے تھے ان علمی مشاغل کی وجہ سے آپ کے مطب پر بیماروں کے علاوہ اہل علم بھی آتے اور آپ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے آپ کے اس علمی حلقہ میں بلا امتیاز مذہب و مسلک ہر قسم کے لوگ آتے آپ ہر موضوع

پر نہایت تحمل سے اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ایک وقت آیا کہ آپ کا یہ علمی حلقہ بڑھتا گیا پھیلتا گیا اور آپ کی دانشورانہ گفتگو کا اہل علم میں چرچا ہونے لگا۔

ان دنوں حکیم مرحوم کا یہ معمول تھا۔ کہ نماز جمعہ ادا کرنے کے لیے حضرت گنج بخش لاہوری کی جامع مسجد جاتے نماز پڑھنے کے بعد سید ابوالحسن ہجویری رضی اللہ عنہ کے مزار پر حاضری دیتے فاتحہ پڑھتے داتا صاحب کے مزار کے باہر بازار میں آتے تو نوری کتب خانہ میں آبیٹھتے۔ ان دنوں نوری کتب خانہ حضرت سید محمد معصوم شاہ نوری الکیلانی کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ اس کتب خانے کی خصوصیت یہ تھی کہ اعلیٰ حضرت کے رسائل چھپتے اور نہایت ارزاں ہدیہ پر لوگوں کو دیے جاتے۔ حکیم صاحب ہر جمعہ کی نماز کے بعد نوری کتب خانہ سے چند کتابیں خریدتے اور سید محمد معصوم شاہ نوری رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس سے فیضیاب ہوتے۔ ان دنوں گنج بخش روڈ پر مکتبہ نبویہ اور المعارف کھلے تو حکیم صاحب ان کتب خانوں پر ضرور آتے اپنی دلچسپی کی کتابیں خریدتے آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ مسلم مسجد کے زیر سایہ مولوی شمس الدین تاجر کتب نادرہ کی دکان پر ضرور آتے۔ یہ دکان ایک طرف نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ تھی دوسری طرف کتاب دوست اہل علم و فضل کا مرجع تھی۔ حکیم صاحب نے اس دکان پر نایاب کتابوں سے شناسائی حاصل کی پھر یہاں پر آنے والے اہل علم و فضل سے تعارف ہونے لگا۔ اور آپ کا علمی حلقہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا۔

ہمیں یاد ہے کہ حکیم صاحب نے اہل علم احباب کا ایک اجلاس طلب کیا۔ یہ اجلاس مولانا محمد سعید نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (جو ان دنوں جامعہ مسجد شاہ محمد غوث بیرون اکبری دروازہ لاہور کے خطیب تھے) کے حجرے میں ہوا تھا۔ جس میں حکیم صاحب نے ایک منصوبہ پیش کیا کہ اہلسنت کی اعتقادی کتابوں کی اشاعت کی جائے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ پاکستان میں سنیوں کی اکثریت کے باوجود کتابی دنیا اور اشاعتی میدان میں بہت کم کام ہو رہا ہے۔ آپ نے مولانا محمد سعید احمد نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ عبدالنبی

کوکب کو تصانیفی اور تالیفی کام کا سربراہ منتخب کیا اور بعض مفید کتابوں کی اشاعت کے لیے آمادہ کیا اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ لاہور میں ''یوم رضا'' کا انعقاد ہونا چاہیے۔ اجلاس میں ان تین بزرگوں کے علاوہ مولانا باغ علی نسیم، مولانا محمد شفیع رضوی۔ مولانا قیوم الٰہی عرفانی۔ اور راقم کے ساتھ چند اور مقامی علماء تھے۔ اسی مجلس میں ہی تمام حضرات نے فنڈ جمع کیا اور کام کا آغاز ہوا۔ مولانا محمد سعید احمد نقشبندی اور مولانا عبدالنبی کوکب کے ذمہ چند اعتقادی کتابوں کے تراجم لگائے گئے۔ اور حکیم صاحب خود یوم کی تیاری کے لیے شب و روز کام کرنے لگے۔ اس وقت تک مرکزی ''مجلس رضا'' کا نام یا قیام عمل میں نہیں آیا تھا۔ حکیم صاحب۔ اور مولانا کوکب مرحوم کی خواہش تھی کہ ''یوم رضا'' کے موقع پر اپنے روایتی علماء کرام کے علاوہ دوسرے دانشوروں اور ادیبوں کو بھی سامنے لایا جائے۔ اور وہ بھی امام احمد رضا کی علمی خدمات پر بات کریں۔ اس سلسلہ میں حکیم صاحب بذات خود کئی دانشوروں کے پاس گئے اور انہیں یوم رضا پر تقریر کرنے پر آمادہ کیا۔ دوسری طرف علامہ عبدالنبی کوکب نے بعض ادیبوں، دانشوروں اور غیر سنی مشاہیر سے رابطہ کر کے ان کے پیغامات اکٹھے کیے۔ ''یوم رضا'' کا پہلا اجلاس برکت علی محمدن ہال موچی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں روایتی علماء کرام سے ہٹ کر نئے چہرے سامنے آئے، نئے بیانات آئے، نئے انداز آئے اور جو لوگ امام اہلسنت مولانا احمد رضا کے افکار اور ان کی کتابوں سے ناآشنا تھے۔ وہ بھی فاضل بریلوی کی تعریف میں رطب اللسان بن گئے اس اجلاس میں اپنے علماء میں سے مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا محمد شفیع اوکاڑوی۔ مولانا غلام علی اوکاڑوی کے علاوہ نئے مقررین لائے گئے۔ یہ پہلا تجربہ تھا جس نے سنی علماء میں اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے مطالعہ کی اہمیت کو بیدار کیا۔ ''یوم رضا'' کی روئیداد چھپی۔ تو اس میں مقررین کے علاوہ مولانا مودودی۔ (جو ان دنوں جماعت اسلامی کے بانی ہونے کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں پر تھے) پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ر. فسر علامہ علاء الدین صدیقی،

مولانا عبدالستار خاں نیازی، مولانا ابراہیم علی چشتی، میاں محمد شفیع (م ش) نوائے وقت اور کئی دوسرے دانشوروں کے پیغامات چھپے اور حکیم صاحب نے اسے روئیداد کی شکل میں ملک کے گوشے گوشے تک پھیلا دیا۔ سنی حلقہ علمی رابطے کے اس انداز سے آشنا نہ تھا۔ مگر جہاں جہاں یوم رضا کی روئیداد پہنچی لوگ حکیم صاحب سے رابطہ کرنے لگے۔

علامہ عبدالنبی کوکب مرحوم نے ہر سال پر یوم رضا کی رپورٹیں مرتب کیں۔ اور حکیم صاحب نے انھیں چھپوا کر ''دائرۃ المصنفین لاہور'' کی طرف سے شائع کیا۔ ان رپورٹوں میں پہلی بار ارباب علم و فضل نے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا اپنے تو اپنے اعلیٰ حضرت کے مخالفین نے بھی فاضل بریلوی کی فقہی اور علمی بصیرت کو خراج تحسین پیش کیا یہ ایک نیا انداز تھا جسے اہل علم سنیوں نے بے حد پسند کیا اور اس طرح لوگوں میں اعلیٰ حضرت کی کتابوں کی جستجو کا ذوق پیدا ہوا۔ مولانا کوکب مرحوم ان دنوں جماعت اسلامی کے بانی مولانا مودودی سے بہت متاثر تھے۔ ان کی جماعت کے قریبی حلقوں میں رسائی تھی۔ اور ان کے تبلیغی انداز کے سائنٹیفک انداز کو جانتے ہوئے پسند فرماتے تھے انہوں نے ان سہ سالہ رپورٹوں میں اہلسنت کے علاوہ ایسے دانشوروں کے تاثرات بھی شائع کر دیے۔ جو ''ہجو ملیح'' کی ایک جھلک تھی۔ علماء اہلسنت نے اس بات کا نوٹس لیا۔ خصوصاً ہندوستان کے بعض جید علمائے اہلسنت نے حکیم صاحب کو متنبہ کیا کہ آپ کے سٹیج سے ایسی عامیانہ تحریروں کو پسندیدگی حاصل نہیں ہو سکتی۔ حکیم صاحب ایک کھلے دل و دماغ کے مالک تھے آپ نے غور کیا تو اس سلسلہ کو آئندہ کے لیے روک دیا گیا۔

''یوم رضا'' اور ان کی روئیدادوں کی اشاعت کے بعد حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی شخصیت علمائے اہلسنت میں ابھرتی ہوئی نظر آئی۔ حکیم صاحب نے یوم رضا کا اہتمام اور لٹریچر کی اشاعت کی ذمہ داری خود سنبھال کر ''مرکزی مجلس رضا'' کی بنیاد رکھی اور اپنے مخلص احباب کے ساتھ مل کر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے افکار کی اشاعت پر بھرپور

کام کا آغاز کیا ایک وقت آیا کہ ''یوم رضا'' برکت علی محمدن ہال کی بجائے نوری
ریلوے اسٹیشن لاہور میں منایا جانے لگا۔ ملک کے مقتدر علمائے کرام اور دانشور اس
پر اظہار خیال کرنے لگے حکیم صاحب مرحوم کی عادت تھی کہ قابل ترین علماء کرام اور
بڑے سنجیدہ دانشوروں کا انتخاب کرتے اور انہیں خود موضوعات دیتے اور لوگ دور دراز
سے چل کر آتے جلسہ میں عمدہ خیالات کا اظہار ہوتا سامعین کا زیادہ حصہ علمی بصیرت کا
مالک ہوتا اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے اعتقادی نظریات سے دلچسپی رکھتا۔ یوم
رضا کی تقریب بڑی باوقار اور شاندار ہوتی۔ حکیم صاحب خود سارا دن دروازے
کھڑے ہوتے۔ آنے والوں کا استقبال کرتے۔ سٹیج پر علماء کا کنٹرول ہوتا اور حکیم
صاحب ایک کارکن کی حیثیت سے شام تک کام کرتے۔ یوم رضا کی تقریبات سے
فارغ ہو کر مرکزی مجلس رضا نے اشاعتی کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کر دیا۔
''یوم رضا'' پر بڑا شاندار اشتہار چھپتا جو کتابت اور طباعت کا ایک عمدہ نمونہ ہوتا پھر
اسے سارے پاکستان میں ڈاک کے ذریعہ پھیلا دیا جاتا۔ مجھے یاد ہے ایک بار حکیم
صاحب نے ''یوم رضا'' کے دس ہزار اشتہار چھپوا کر ملک کے گوشے گوشے تک
پہنچائے اور اشتہاری زبان میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کا تعارف کرایا دوسری طرف
آپ نے اعلیٰ حضرت کی کئی کتابیں اور ان کے علوم پر کئی رسالے چھپوا کر مفت تقسیم کرنا
شروع کر دیئے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے سٹیج سے حکیم صاحب کی نگرانی میں ہزاروں
نہیں لاکھوں کتابیں چھپتیں اور تقسیم ہوتیں۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے شب و روز ایک کر دیا۔ اعلیٰ حضرت کے تعارف
کے لیے صبح و شام وقف کر دیئے۔ آپ کے احباب رات گئے تک کتابوں کے پارسل
تیار کرتے اور علی الصبح ڈاک کے حوالے کرتے جاتے۔ حکیم صاحب رات گئے تک
اپنے چند رضا کاروں کو لے کر لاہور کے گلی کوچوں میں پہنچتے۔ اشتہار لگواتے اور لاہور
کے لوگ صبح اٹھتے تو دیواروں پر اشتہار دیکھ کر کہتے:

؎ گونج گونج اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستان

ہم ان کتابوں کی تفصیلات میں نہیں جانا چاہتے جو مرکزی مجلس رضا نے شائع کی
تھیں مگر اعلیٰحضرت کی سب سے پہلی کتاب ''تجلی المشکواۃ'' چھپی اور بڑی خوبصورت
چھپی۔ پانچ ہزار چھپی۔ وہی کتاب مکتبہ نبویہ نے ایک ہزار چھپوا کر کتابی مارکیٹ میں
پھیلا دی۔ حکیم صاحب کا طریق کار یہ تھا۔ جو شخص دینی مسائل سے دلچسپی رکھتا اسے
کتاب ضرور دیتے۔ کئی علماء، کئی طلبہ کئی دفتری کلرک، کالجوں کے کئی نوجوان، حکیم
صاحب کے پاس جاتے مفت کتابیں حاصل کرتے پھر کئی کتابیں ڈاک کے ذریعہ
ملک کے دانشوروں، پروفیسروں، وکیلوں، ججوں، خطیبوں، ادیبوں اور صحافی دنیا کے
افراد کے گھر پہنچا دیتے۔ کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے ''مرکزی مجلس رضا'' کی چھپی
ہوئی ہر کتاب اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے نظریات لے کر لوگوں کے گھر پہنچ جاتی
مولانا محمد سعید شبلی کی ایک کتاب فضائل درود شریف پر چھپی۔ ہزار نہیں دو ہزار نہیں دس
ہزار چھپ کر تقسیم ہوئی جو لوگ اعلیٰ حضرت کے نام سے چڑتے تھے وہ جب ''مرکزی
مجلس رضا'' کی طرف سے ایسی کتابیں پاتے تو ان کے دلوں کے گوشے نرم ہو
جاتے۔ اور آہستہ آہستہ حضور کی محبت کی نسیم جان فزاء ان کے دلوں کو تازہ جھونکا دیتی
اعلیٰ حضرت سے بے رخی کے باوجود ان کی زبانوں پر ہوتا

ع مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام

ریڈیو پر میلاد کی محفلیں منعقد ہونے لگیں اس میں اعلیٰ حضرت کی نعتیں اور سلام
رضا پڑھا جانے لگا۔ حکیم صاحب نے عام رسالوں کی اشاعت سے ابھر کر ''فتاوی
رضویہ'' چھپوانے کا پروگرام بنایا۔ سب سے پہلے آپ نے فتاوی رضویہ کی ''کتاب
النکاح'' تیار کی۔ بڑی خوبصورت تیار کرائی نفیس کتابت کرائی۔ جسٹس شجاعت علی
قادری مرحوم نے بڑا پر مغز دیباچہ لکھا کتاب تیار ہوئی تو راقم کی استدعا پر ''مکتبہ نبویہ''
کو اشاعت کے لیے دے دی گئی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کے عقائد و نظریات

ہر سمت سے عوام تک پہنچیں۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ کہ جب دیو بندی مکتب فکر اور جماعت اسلامی کے دانشوروں کی تحریروں سے لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے یہ لوگ، یونیورسٹیوں، کالجوں، سکولوں اور مدرسوں میں اسلام کے نام پر کتابیں شائع کرتے تھے۔ حالانکہ یہ لوگ تشکیل پاکستان کے مخالف تھے۔ قیام پاکستان کے وقت ہندوؤں کی سیاسی جماعتوں کے کیمپوں سے نکل نکل کر پاکستان کے خلاف تقریریں کیا کرتے تھے۔ جب پاکستان بن گیا تو پاکستان میں چلے آئے یہ لوگ عوام کے سامنے آنے کی بجائے ''پناہ گیر'' بن گئے اور اپنے عقائد اور نظریات کو کتابوں کے ذریعہ پھیلانے لگے۔ مرکزی مجلس رضا کو اس بات کا سخت دکھ تھا کہ پاکستان کے مخالف، نظریہ پاکستان کے مخالف، عقائد اہلسنت کے مخالف، اعلیٰ حضرت کے نظریات کے مخالف، تو دینی قیادت کے کرتا دھرتا بن گئے مگر پاکستان پر جان دینے والے صحیح العقیدہ اور سنی علماء و مشائخ گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔

ع منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

حکیم صاحب نے ان حالات کا مطالعہ کیا آگے بڑھے اور گلی گلی کوچہ کوچہ پھر کر دیکھا بدعقیدہ لوگ دندناتے پھر رہے ہیں اور جو لوگ حضور کے شیدائی ہیں وہ گوشہ نشین ہیں۔ انہیں اس بات کا بڑا دکھ تھا وہ اٹھے اور تہیہ کر کے اٹھے کہ وہ مظلوم سینوں کو بیدار کریں گے اور برصغیر کے ایک مظلوم راہنما کی تعلیمات کو عام کریں گے۔ مرکزی مجلس رضا کی طرف سے پہلی دفعہ جب ملک شیر محمد اعوان آف کالاباغ کی کتاب ''محاسن کنز الایمان'' چھپ کر ملک میں پھیلی تو لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں کہ دیو بندی علماء نے قرآن کے تراجم میں کتنی گستاخیاں کی ہیں اور عامیانہ ترجمے کیے ہیں جب لوگوں نے کنز الایمان اور دیو بندی حضرات کے قرآنی ترجموں کا موازنہ کیا۔ تو حیران رہ گئے ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ یہ لوگ دین کے نام پر لوگوں کو کن راہوں پر لے جا رہے ہیں حکیم صاحب نے محاسن کنز الایمان کی بیس ہزار کاپیاں چھپوا کر ملک میں تقسیم کیں تو

لوگ ششدر رہ گئے۔ اس کے بعد مولانا غلام رسول صاحب سعیدی کی ''ضیائے کنز الایمان'' نے اس موضوع کو آگے بڑھایا تو ہزاروں لوگ دیو بندیوں کے اردو تراجم سے دستکش ہو گئے۔

ہمارے ایک دانشور افسر پنجاب کے ایک محکمہ کے ڈائریکٹر تھے وہ دیو بندی مکتب فکر کی علمی خدمات کے بڑے معترف تھے ان کے تراجم قرآن کے بڑے مداح تھے، حکیم صاحب کی ڈاک نے انہیں ''محاسن کنز الایمان'' پہنچایا۔ انھوں نے مطالعہ کیا تراجم کا موازنہ کیا پھر کیا تھا جب بھی اپنی مجالس میں قرآنی ترجموں کی بات کرتے کہتے جو کتاب جس کی چاہو پڑھو مگر قرآن کا ترجمہ پڑھنا ہو تو صرف ''کنز الایمان'' ہی پڑھو۔ یہ تھا وہ فکری انقلاب جو حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی اشاعتی کوششوں سے پیدا ہوا۔ حکیم صاحب مرحوم ''مرکزی مجلس رضا'' کی چھپی ہوئی کتابیں ہندوستان بھر کے علمائے اہلسنت کی طرف روانہ کرتے اور مسلسل روانہ کرتے رہتے جس سے ہندوستان میں بھی فاضل بریلوی کا چرچا نئے انداز سے ہونے لگا ''مرکزی مجلس رضا'' نے ایک سو سے زیادہ کتابیں شائع کیں ہر کتاب کے کئی کئی ایڈیشن چھپے اور تقسیم ہوئے اعلیٰ حضرت کی کئی کتابیں پشتو، سندھی میں بھی چھپیں اور علاقائی طور پر لوگوں کو متاثر کرتی رہیں ان کتابوں نے ایک جہان کو خوش کام کیا۔ حکیم صاحب کی ایک عادت تھی کہ وہ اپنی مجلس میں بیٹھنے والے اہل علم کو افکار رضا پر لکھنے پر آمادہ کرتے ان سے کتابیں لکھواتے چھپواتے اور تقسیم کرتے آج ہمارے ملک میں کتنے ہی ایسے ارباب علم و قلم موجود ہیں جو ''مرکزی مجلس رضا'' سے متاثر ہوئے اور آگے چل کر فاضل بریلوی کے ترجمان بن گئے ایک علمی قافلہ تیار ہوا جو فکر رضا کو لے کر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچا ایک مرکز بنا جس کی روشنیاں چار دانگ عالم میں پھیلتی گئیں ایک چشمہ جاری ہوا۔ جو دماغوں کی خوابیدہ وادیوں کو سیراب کرتا گیا۔ ہم یہ واقعات اس لیے نہیں لکھ رہے کہ ایک شخص کی مدح سرائی کی جائے۔ ہم تو اپنے نوجوان علماء دین کو بتانا چاہتے ہیں کہ دین

کے کام کے لیے اگر ایک طبیب، ایک حکیم، ایک موسیٰ عزم لے کر اٹھ کھڑا ہو تو سارا گلستان مہک اٹھتا ہے۔ سارا دبستان جاگ اٹھتا ہے سارا جہان جگمگا اٹھتا ہے!

آج ہمارے پاس علمائے کرام کی کمی نہیں لکھنے والوں کی کمی نہیں، اچھا لکھنے والوں کی کمی نہیں، خوبصورت لکھنے والوں کی کمی نہیں، اگر کمی ہے تو اس عزم کی ہے جو انسان کو ستاروں پر کمندیں ڈالنے پر آمادہ کر دیتا ہے ہم اپنی اس تحریر میں ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیوں اور اس کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کی رپورٹ پیش نہیں کر سکے مگر ہم نے ایک طائرانہ انداز سے اپنے قارئین کے سامنے وہ باتیں لانے کی کوشش کی ہے جو حکیم اہلسنت کی شبانہ روز زندگی کا عکس تھیں۔ یہ باتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ روزمرہ کی باتیں ہیں دارا و سکندر کی داستان حیات نہیں قیصر و کسریٰ کا تذکرہ نہیں یہ تو ایک درویش بے نوا کی شبانہ روز جد و جہد کی باتیں ہیں!

الحمد للہ ''مرکزی مجلس رضا'' آج بھی حکیم اہلسنت کی متعین راہ پر رواں دواں ہے بے سروسامانی کے باوجود ہزاروں کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کر رہی ہے مرکزی مجلس رضا کا ترجمان ''ماہنامہ جہان رضا'' افکار رضا کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے اس میں رضویت کے بلند پایہ اہل قلم کے مقالات و افکار چھپتے ہیں اس میں فکر رضا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اسے اہل علم اور اہل ذوق دل جمعی سے پڑھتے ہیں اور پورے اعتماد سے ''جہان رضا'' کی تحریروں کو پسند کرتے ہیں اور بقول سعدی شیرازی ''ہمچو نیشکر میخورند''۔ انھیں امام احمد رضا بریلوی کی تعلیمات کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ بلا جھجک مرکزی مجلس رضا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ آج دنیا کے مختلف ممالک میں افکار رضا کے جھنڈے لہراتے نظر آتے ہیں اور ہر زبان میں کتابیں چھپ رہی ہیں امریکہ یورپ افریقی علاقے اور عالم اسلام کے تمام ممالک میں فکر رضا کی روشنیاں پھیل رہی ہیں۔ آج صرف ایک شہر لاہور سے ہی کنز الایمان کی سات لاکھ جلدیں ہر ماہ چھپ کر دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ رہی ہیں ''کنز الایمان''

کے تراجم در تراجم چھپ رہے ہیں۔ مختلف اشاعتی ادارے اس کار خیر میں سرگرم عمل ہیں آج پاکستان میں دیوبندیوں، غیر مقلدوں کے کئی اشاعتی ادارے ''کنز الایمان'' شائع کر کے عوام تک پہنچا رہے ہیں۔ ہندوستان میں بعض سکھ اور ہندو ناشرین بھی کنز الایمان شائع کر رہے ہیں ہمارا دعویٰ ہے کہ کنز الایمان کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی دوسرے ترجمہ قرآن کو نصیب نہیں ہوئی۔

ع چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان میری!

اس کے باوجود مسلک رضا اور افکار رضا کی اشاعت کی ابھی بھی بہت ضرورت ہے پاکستان کی اکثریت (سواد اعظم) سنی العقیدہ لوگوں پر مشتمل ہے انھیں بعض فرقے اپنے لٹریچر سے گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ اور بعض سیاسی تنظیمیں بددل بھی کرتی رہتی ہیں۔ عوام تشنہ لب ہیں انھیں اعتقادی راہنمائی کی ضرورت ہے ان کی خواہش اور ضرورت کے مطابق انھیں دینی راہنمائی نہیں مل رہی علماء کرام کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ قوم کی راہنمائی کریں اور انہیں بدعقیدہ تنظیموں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں۔ مسلک رضا پر صرف جلسے اور وعظ کے مجمع نہ سجائیں حقیقی طور پر مسلک رضا پر لوگوں کو دعوت دیں۔ جو حضرات زبان کی شیرینی سے مسلک رضا لوگوں تک پہنچا سکتے ہیں وہ اللہ کی خوشنودی کیلئے آگے بڑھیں۔ جو قلم کار اپنی روشن تحریروں سے راہنمائی کر سکتے ہیں وہ آگے بڑھیں اور اچھے انداز میں لٹریچر مہیا کریں تاکہ نوجوان طبقہ ان سے استفادہ کر سکے روزی کمانا، اپنے بچوں کو پالنا، اپنے جاہ و جلال کو برقرار رکھنے کے لیے روپیہ پیسہ حاصل کرنا انسانی زندگی کا خاصہ ہے اس کے لیے ہمارے مسلک کے بعض علماء کرام دیار مغرب کے سفر کرتے رہتے ہیں یہ بری بات نہیں مگر اپنے مسلک کی خاطر تھوڑا سا وقت نکال لیں لوگوں کو توجہ دلائیں دنیاداروں کو ترغیب دیں تو مسلک کا کام بھی ہوتا رہنا چاہئے پیران عظام بھی مسلک رضا کی طرف توجہ دیں اپنے حلقۂ عقیدت میں پڑھے لکھے حضرات سے کام لیں تو ایک انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔

آخر میں مقتدر سنی علماء کرام اور صاحبزادگان ذوالاحترام کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ مسلک رضا کے لیے ''مرکزی مجلس رضا'' کی خدمات حاصل کریں۔ اس کے فورم کو استعمال میں لائیں اس کی راہنمائی فرمائیں اس کی مشکلات کا اندازہ کریں اور اس انداز سے کام کریں کہ دنیا بھر کے سنی حضرات کی پیاس بجھ جائے۔

(''جہانِ رضا'' نومبر، دسمبر ۲۰۰۱ء)

الفت ومحبت کا ایک اور چراغ بجھ گیا

الحاج محمد اسحاق نوری رحمۃ اللہ علیہ ...... داروغہ والا لاہور

قلب وجگر کے شبستانوں میں جگمگاتے ہوئے کتنے چراغ بجھتے جارہے ہیں۔ اور غم وملال کے اندھیرے بڑھتے جاتے ہیں۔ الحاج محمد اسحاق نوری بھی الفت ومحبت کا ایک ایسا روشن چراغ تھے جو اجل کی سرسر کے سامنے گل ہوگیا۔ آپ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ (نومبر، ۲۰۰۱ء) کے پہلے ہفتہ میں دل کے ہاتھوں تنگ آکر وادی بقا میں چلے گئے۔ انا للہ انا الیہ راجعون۔

مرحوم مشرقی لاہور کے آرائیں خاندان کے ایک معروف فرد تھے چوک داروغہ والا جی ٹی روڈ لاہور پر ان کی کوٹھی اہل علم وفضل کا مرکز رہی ہے وہ اپنی محبت سے عالم اسلام کے دینی اہل علم اور مشائخ کرام کو اپنی محبت میں مجبور کر کے اپنے گھر لے آتے تھے۔ اور انہیں اپنی مخلصانہ خدمت سے خوش کر کے رخصت کرتے۔ وہ ایک خوشحال زندگی کے مالک تھے۔ مگر ان کی یہ خوشحالی ہمیشہ علماو مشائخ، طالب علموں اور درویشوں کے کام آئی۔ ان کا گھر سارے علاقہ میں اہل محبت کا مرکز تھا۔ وہ کویت کے وزیر اوقاف فضیلت الشیخ حضرت علامہ محمد یوسف رفاعی مدظلہ العالی کو ان کی سرکاری رہائش ''ہوٹل آواری'' لاہور سے اٹھا کر اپنے گھر لے آتے اور اپنے اخلاص اور خدمات سے خوش کردیتے۔ مکہ مکرمہ سے حضرت فضیلۃ الشیخ ڈاکٹر محمد علوی مالکی دامت برکاتہم العالیہ کو ''پرل انٹر کانٹینیٹل لاہور'' سے اٹھاتے اور اپنی رہائش پر ٹھہراتے۔ جہاں اہل محبت کا جمگھٹا ہوتا علماء وطلبہ بلا روک ٹوک چلے آتے اور ہر آنے والے کو سہولت ہوتی۔ ایک عرصہ تک ''ورلڈ اسلامک مشن'' کے چیئرمین قائد اہلسنت الشاہ احمد نورانی صدیقی لاہور

تشریف لاتے تو انہیں ایئر پورٹ سے اپنی کار پر بٹھاتے اور اپنے گھر قیام کرنے پر آمادہ کر لیتے۔ قائد اہلسنت جس جلسے میں جاتے مرحوم آدھی رات تک آپ کے ساتھ ہوتے۔ آپ حضرت مولانا نور اللہ صاحب نعیمی بصیر پوری سے قادری سلسلہ میں بیعت تھے۔ ان کے ساتھ ان کی رفاقت مثالی تھی۔ ان کے دارالعلوم کے خصوصی معاون تھے۔ ہم جیسے نیاز مندان بھی ان کے دولت کدے پر حاضر ہوتے تو وہ سراپا محبت بن کر پیش آتے خوشبودار قہوے کا دور چلتا ان کے بیٹے محمد عبدالرزاق مدنی کا مدینہ سے فون آ جاتا۔ تو مسجد نبوی میں اذان کی آواز کمرے میں نصب لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے ہمارے دل و جان کا وظیفہ بناتے "مرکزی مجلس رضا" کے دفتر مکتبہ نبویہ لاہور آتے بیٹھتے تو بڑی شیریں زبانی سے گفتگو کرتے۔ نبی کریم ﷺ صاحب کوثر و تسنیم پر درود شریف پر چھپی ہوئی کتابیں خریدتے اور اپنے احباب میں تقسیم کرتے جاتے اگرچہ ہم کتب فروش تھے۔ مگر ہم سے ہی کتاب خرید کر ہمیں ہی تحفہ دیتے۔ ان کی یہ ادا ان کی محبت رسول کی علامت تھی۔

وہ ہر سال شہر محبت (مدینہ منور) میں حاضری دیتے۔ اور بعض اوقات شعبان میں چلے جاتے اور حج کر کے لوٹتے۔ ان کے دونوں بیٹے محمد عبدالرزاق مدنی اور محمد حامد مدنی مدینہ پاک میں حرم شریف کی روشنیوں کی تابانیوں کو برقرار رکھنے کے لیے خدمت کرتے۔ ہمیں جب پہلی بار حضور کی بارگاہ میں ۱۹۹۲ء میں حاضری کا موقع ملا تو مدینہ منورہ میں ہمارا ایک ہوٹل میں قیام تھا۔ حرم شریف میں ملے تو اپنے بیٹے عبدالرزاق کو کہا ہوٹل سے فاروقی صاحب کا سامان اٹھا کر اپنے گھر لے آؤ۔ سارا رمضان اپنا "یہاں بنائے رکھا اپنے گھر کی مجالسِ نعت میں حصہ دیا۔ مدینہ پاک میں دوسرے احباب کے ہاں محافلِ نعت ہوتیں تو ساتھ لے جاتے الشیخ عادل کے محلات میں عربی نعت خوانوں کی مجالس نعت ہوتیں تو ساتھ رکھتے۔ اس طرح ان کی رفاقت سے کئی کئی نعمتوں سے ہمیں حصہ ملتا۔

۱۹۹۲ء کے بعد ہمیں ہر سال بارگاہ رسول کی حاضری کا موقع ملتا تو الحاج محمد اسحاق نوری رفیق مدینہ بن کر ساتھ رکھتے محافل نعت میں لے جاتے ساری ساری رات شہر محبت کی رونقوں سے نوازتے۔

حضرت مولانا ضیاء الدین قادری رضوی خلیفۂ مجاز اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کے صاحبزادہ فضیلت الشیخ حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں انہی کی وساطت سے حاضری ہوتی۔ آپ کے دونوں مدنی صاحبزادے حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی کے غلاموں میں تھے۔ وہ ساتھ جاتے تو ہمیں حضرت کی خصوصی صحبت میسر آتی۔ جب تک حاجی محمد اسحٰق نوری مرحوم، ان کے بیٹے اور راقم شریک محفل رہتے کسی دوسرے کو اندر آنے کی اجازت نہ ہوتی یہ خصوصیت صرف اور صرف حاجی صاحب مرحوم کی بدولت ہوتی۔

پچھلے سال آپ کو دل کا عارضہ تھا۔ حضور کی بارگاہ میں اعتکاف بیٹھے تو ان کا بیٹا حامد مدنی گھر سے سحری کے وقت جو کی روٹی پکوا کر لاتا۔ حاجی صاحب مرحوم راقم کو سحری کے دستر خوان پر "دعوت نانِ شعیر" دیتے اور ہر روز نئے نئے جو کی نئی قسم کی روٹی کھلاتے یہ ان کی محبت تھی یا مجھے نان شعیر کھلا کر "قوت حیدری" سے آشنا کرنا چاہتے تھے۔

ان کی وضع داری اور علم نوازی کا یہ عالم تھا کہ لاہور میں کوئی عالم دین بیمار ہوتا تو خود چل کر اس کے گھر جاتے۔ بیمار پرسی کرتے۔ اور علاج معالجہ کے لیے مالی امداد کرتے کسی عالمِ دین یا طالبِ علم کی مالی پریشانی کا سنتے تو خفیہ طور پر اس کی امداد کرتے مجالس نعت اور تقریبات میلاد میں ان کی حاضری یقینی ہوتی حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر کثرت سے حاضر ہوتے اور کافی وقت بیٹھے رہتے۔

آج کا زمانہ ان شفقتوں، ایسی خدمات اور ایسے رویوں سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ خال خال کہیں کہیں دور دراز بعض افراد نظر آتے ہیں۔ حاجی محمد اسحٰق نوری مرحوم ایسے روشن ضمیر لوگوں میں سے ایک تھے۔ ان کی زبان سے کبھی کسی کی دلآزاری نہیں ہوئی

تھی ان کے عمل سے کسی کو کبھی تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے علاقہ میں ایک محترم شخصیت مانے جاتے تھے۔ وہ اپنی برادری میں ایک نیک سیرت فرد تسلیم کیے جاتے تھے۔ وہ علماء کرام کے محبوب نظر تھے وہ نعت خوانانِ مصطفیٰ کے محبّ تھے۔ وہ سادات کا بے حد احترام کرتے تھے موت سے پہلے اپنے بیٹوں کو کہا جنازہ کوئی سید زادہ پڑھائے چنانچہ ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔

اللہ تعالیٰ الحاج نوری صاحب کی قبر کو اپنی رحمتوں کی بارش سے ٹھنڈا رکھے۔

مرزا استاد غلام قادر بھی چلے گئے:

ہمارے جلیس مجالس، علم و دانش کی شمع فروزاں، وضع داری اور مردم شناسی کی مثالی شخصیت استاد مرزا غلام قادر بھی ہمیں داغ مفارقت دے گئے ان سے ہمیں چالیس سال سے زیادہ عرصہ تک نیاز مندی تھی۔ مولوی شمس الدین مرحوم تاجر کتب نادرہ، زیرِ سایہ مسلم مسجد لوہاری دروازہ لاہور کی علمی اور کتابی مجالس کے مخلص احباب میں سے تھے جن کی زبان وقلم نے ہمیشہ دل و دماغ کی توانائیاں بخشیں۔ مولوی شمس الدین مرحوم کی محفل اجڑی تو انہوں نے ہماری محفلوں کو رونق بخشنا شروع کر دی اور تا دم آخر جلیس محفل اور رفیقِ علم وفضل رہے جب رمضان المبارک کو ہم دیارِ حبیب کو روانہ ہونے لگے تو ''بسلامت روی وباز آئی'' کہہ کر الوداع کہہ رہے تھے۔ ہم واپس آئے تو ہمیں دیدار بخشے بغیر ہی رخصت ہو گئے...... رفتید و لے نہ از دلِ ما!

ان کے جانے کا بے حد ملال ہوا۔ دل کو صدمہ ہوا۔ ہم نے انہیں یاد کیا۔ پکارا اور ایک جھلک دیکھنے کی تمنا کی مگر موت کی وادی میں جانے والے کب واپس دیکھتے ہیں۔

ع رو پس نہ کرد ہر کہ ازیں خاکداں گزشت

علامہ مرحوم ابنِ میاں احمد دین بن حسن محمد گوجرانوالہ (مرالی والا) میں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے لاہور آئے تو اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا اور ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مولانا نور الحق علوی، مولانا محمد یٰسین فلسفی جیسے اساتذہ سے ادب اردو اور فارسی کا مطالعہ کیا۔ آپ نے

مولانا محمد یٰسین سے فلسفہ اور منطق کی ابتدائی اور منتہی کتابیں پڑھیں اور افغانستان کے ایک عالم دین سے فلسفہ، علم الکلام، منطق اور معانی کے مختلف مدارج کو سمجھا اور حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی ساری کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں۔ ''فصوص الحکم'' اور ''فتوحات مکیہ'' اور ان کی شروحات کی روشنی میں مکتوبات مجدد الف ثانی کا موازنہ کیا وہ فلسفۂ وحدت الوجود اور وحدت الشہود پر بڑی پر مغز گفتگو کرتے تھے۔

وہ جب اساتذہ کے عربی اور فارسی اشعار سناتے تو دل خوش ہو جاتا جب ان کی تشریح کرتے تو یوں محسوس ہوتا کہ ہم قدیم فارسی شعراء کی مجلس میں بیٹھے ہیں۔

''اللہ انہیں اپنی رحمتوں کے دامن میں ہمیشہ ہمیشہ رکھے''۔

(''جہانِ رضا'' فروری ۲۰۰۲ء)

”مرکزی مجلسِ رضا“ کے ننھے منّے مجلسی

پیر محمد حسن شاہ نوری الگیلانی:

”جہانِ رضا“ کے سابقہ دو شماروں میں ”مرکزی مجلس رضا کے ننھے منّے مجلسی“ کے عنوان سے ایک کالم آرہا ہے۔ جسے بہت سے اہل علم، خصوصاً حلقۂ رضویہ کے قارئین نے بے حد پسند کیا۔ بعض حضرات نے خطوط کے ذریعہ سراہا بعض نے فون پر اظہار مسرت فرمایا۔ بعض بذات خود بقدم خود، بجمال خود تشریف لائے اور اس کالم کو ایک لطیف تحریر قرار دیا۔ ان حضرات میں بعض بزرگ علماء اور دانشور بھی تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا ذکر بھی اس کالم میں آئے۔ ہم نے ایسے بزرگوں سے معذرت کی کہ آپ ”ننھے منھے مجلسی“ نہیں ہو سکتے وہ ہماری بات پر خاموش ہو گئے مگر ایک دن ایک سنی عالم دین تشریف لائے۔ فرمایا: اگرچہ میں زندگی کے ستر سال گزار چکا ہوں مگر آپ لوگ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سو پچاسواں یوم ولادت منا رہے ہیں اس لیے ہم ان کے حضور تو ننھے منھے ہی ہیں! ان کی بات سے ہمارا دل لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہم اٹھے ان کے ہاتھ چومے پھر انتہائے شوق سے عمامے کو بوسہ دیا بٹھایا۔ اور پھر تمام عمر کے اہل محبت کو مجلس رضا کے ننھے منھے جلیس تسلیم کر لیا ہے۔

ع ہزار سال سے غنچے کھلے ابھی تر ہیں!

ابھی ہم نے یہ فیصلہ کیا ہی تھا کہ ہمارے دفتر کے سامنے ایک گاڑی آ کر رکی تو دیار حبیب کے قیام کے ساتھی ایک ”شیخ“ گاڑی سے اترتے نظر آئے ہم آگے بڑھے۔ آنکھیں فرش راہ کیں زبان نے پکارا:

آمد سنی کسی کی تو واللہ رے اشتیاق   آنکھیں بچھائیں ہم نے جہاں تک نظر گئی

انہیں لا کر اپنے پاس بٹھایا۔ یہ تھے صاحبزادہ پیر سید محمد حسن شاہ صاحب گیلانی النوری مدظلہ العالیہ۔ آپ کئی ماہ کے بعد لاہور آئے تھے اور گھر جانے سے پہلے ہمیں اپنے دیدار سے نوازتے ہوئے تشریف لے آئے حضرت پیر صاحب ہمارے مدینہ منورہ کے قیام کے دوران دربار مصطفیٰ میں ہم سے فقیروں کو اپنی رفاقت سے نوازتے ہیں دوسرے لفظوں میں ہم حرم نبوی کے باب مجیدی کے اندران کے اصحاب کی مجالس کے خواجہ تاش بن جاتے ہیں۔

پیر سید محمد حسن شاہ نوری الگیلانی گجرات کے سادات خانوادہ کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ”قادریہ نوشاہیہ سلسلہ تصوف“ کی خانقاہ عالیہ، چک سادہ کے سجادہ نشین ہیں۔ آپ کے والد مکرم حضرت پیر سید محمد معصوم شاہ نوری گیلانی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان بننے سے بہت پہلے گجرات سے لاہور آئے تو حضرت داتا گنج بخش کے مزار پر انوار کے نزدیک ایک حجرے کو اپنی قیام گاہ بنایا اور اسی حجرے میں عبادت و ریاضت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار و نظریات کی اشاعت کا ایک اہم مرکز قائم کیا۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک یہ مرکز اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی تالیفات کو عوام تک پہنچانے میں سرگرم عمل ہے۔

حضرت سید محمد معصوم شاہ نوری کے دونوں نامور فرزندوں سید محمد حسین شاہ صاحب گیلانی اور صاحبزادہ سید محمد حسن شاہ صاحب نوری نے فاضل بریلوی کی تصانیف کو عام کرنے میں اپنے والد مکرم کا بھرپور ساتھ دیا۔ اور اعلیٰ حضرت کی دو سو سے زائد کتابوں کو شائع کر کے برصغیر پاک و ہند کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ ۱۹۵۶ء میں مفتی احمد یار خان نعیمی نے گجرات سے اپنی مشہور کتابوں جاء الحق، تفسیر نعیمی اور مرآۃ المناجیح شرح مشکوٰۃ المصابیح کی تصانیف کا آغاز کیا تو پیر سید محمد معصوم شاہ نوری نے ان کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ جس سے مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کو بڑا حوصلہ ملا۔ ”جاء الحق“ نے اعتقادی دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ ”تفسیر نعیمی“ کی پہلی جلدیں آئیں تو علمائے اہلسنت نے اسے بڑا پسند کیا۔ جاء الحق اور تفسیر نعیمی کی ابتدائی جلدیں تو مفتی احمد یار

خان نعیمی نے گجرات سے شائع کیں مگر شرح مشکوۃ المصابیح کا پہلا ایڈیشن پیر محمد معصوم شاہ نوری کے ایک مرید روف احمد نوشاہی مرحوم کے اہتمام میں شائع ہوا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے سید محمد معصوم شاہ نوری نے اعلیٰ حضرت کے رسالوں کی اشاعت کا اہتمام کیا۔ اور چند برسوں میں فاضل بریلوی کے دو سو سے زائد رسالے نوری کتب خانہ کے اہتمام میں چھپ کر سامنے آئے سید محمد معصوم شاہ نوری اور پیر سید محمد حسن شاہ صاحب گیلانی کا یہ اشاعتی کام تمام ناشرین کتب دینیہ سے منفرد بھی تھا اور ممتاز بھی سارے پنجاب میں اعلیٰ حضرت کے خلیفہ مجاز حضرت علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ کوئی شخص اعلیٰ حضرت بریلوی کی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ نوری کتب خانہ لاہور کا یہ کارنامہ اعتقادی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا کہ جن دنوں سارے پنجاب میں کوئی ناشر اس طرف ہاتھ نہیں بڑھاتا تھا۔ سید محمد معصوم شاہ نوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فرزند ارجمند صاحبزادہ محمد حسن شاہ نوری الگیلانی کو ساتھ لے کر فاضل بریلوی کی کئی کتابوں کو زندہ کر دیا نوری کتب خانہ نے ۱۹۵۹ء میں پہلی بار اپنے اہتمام میں اعلیٰ حضرت کا ''کنزالایمان فی ترجمۃ القرآن'' شائع کیا۔ اسی عرصہ میں ہمارے فاضل دوست مولانا محمد اطہر نعیمی صاحب کے والد مکرم مولانا محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ کنزالایمان مع تفسیر خزائن العرفان کا مراد آبادی کا عکس کراچی سے شائع کر کے اولیت حاصل کر چکے تھے انہی دنوں مقبول عام پریس لاہور اور مکتبہ نبویہ جامع مسجد نبویہ متصل سٹی کوتوالی، دہلی دروازہ، لاہور نے جلی حروف میں کنزالایمان کے ایڈیشن شائع کیے تھے۔ پھر تاج کمپنی لمیٹڈ کراچی کے مالک شیخ عنایت اللہ مرحوم نے کنزالایمان کا ایک خوبصورت ایڈیشن شائع کیا۔ یہ ابتدائی دور تھا۔ آج علمی آسمان پر آفتاب رضویت درخشاں ہے اور کنزالایمان کی لاکھوں جلدیں چھپ چھپ کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ رہی ہیں۔ فاضل بریلوی کی بے شمار کتابیں پاک و ہند کے اشاعتی ادارے چھپوا کر پھیلا رہے ہیں۔

ع گونج گونج اٹھے ہیں نغمات رضا سے بوستاں!

سید محمد حسن صاحب گیلانی نوری نے نوری کتب خانہ کے سٹیج سے اعلیٰ حضرت کے رسالے چھپوائے تو خریدار بہت کم تھے۔ لوگ آتے ایک دو رسالے لیتے اور چلے جاتے۔ مجھے سید محمد حسن شاہ نوری صاحب نے بتایا کہ علمائے اہلسنت میں واحد شخصیت شیخ الحدیث مولانا سردار احمد فیصل آباد ایسی تھی۔ جس نے اعلیٰ حضرت کے رسالوں کے سلسلہ میں ہمارے ساتھ مخلصانہ تعاون کیا وہ حضرت داتا گنج بخش کے مزار پرانوار پر حاضری دینے آتے تو نوری کتب خانہ میں ضرور آتے اور میرے والد مکرم کے پاس بیٹھتے اور فرماتے شاہ صاحب جو رسالے کوئی نہیں خریدتا وہ مجھے دے دیں وہ رقم ادا کرتے اور فیصل آباد لے جاتے وہاں جا کر اپنے حلقہ احباب میں تقسیم کرتے اور انہیں پڑھنے پر آمادہ فرماتے۔

سید محمد حسن شاہ گیلانی نوری صاحب نے پہلی بار اپنے والد مکرم کے ساتھ ۱۹۵۵ء میں حج کیا۔ دوسری بار ۱۹۶۲ء میں حج کیا۔ پھر ۱۹۸۲ء سے مسلسل آج تک (پورے بیس سال) ہر سال رمضان کا پورا مہینہ عمرہ کرنے کے بعد دربار نبوی میں گزارتے ہیں۔ اور شوال کے وسط میں واپس آتے ہیں۔ دیار حبیب میں ان کا ایک اپنا حلقہ ہے، احباب ہیں، رفقاء ہیں، علماء کرام ہیں، نعت کی مجالس ہیں۔ ان کے احباب میں پاکستانی ہیں، ہندوستانی ہیں، مکی ہیں، مدنی ہیں، یمنی ہیں، ترکی ہیں، سوڈانی ہیں، عربی ہیں، عجمی ہیں۔

صاحبزادہ سید محمد حسن شاہ گیلانی کی حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بڑی مخلصانہ رفاقت رہی ہے۔ حکیم مرحوم برکت علی محمدن ہال میں ''یوم رضا'' منایا کرتے تھے پھر سید محمد حسن شاہ گیلانی کی فرمائش پر ریلوے اسٹیشن کے سامنے نوری مسجد میں ہر سال یوم رضا منایا جانے لگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اجلاس ہوتے۔ ملک کے چند علمائے کرام اور سکالرز اعلیٰ حضرت پر مقالات پیش کرتے اور لوگ دور دور سے چل کر نوری مسجد لاہور میں یوم رضا کے سلسلہ میں آتے۔ یہ اجلاس ۱۹۸۴ء تک ہر سال ہوتے رہے تھے۔ ''یوم رضا'' کا مرکزی مقام نوری مسجد ریلوے اسٹیشن لاہور ہی تھا۔

اس مسجد کی بنیاد سید محمد معصوم شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک دوست اور مرید ڈاکٹر [illegible] حسین مالک پنجاب ہوٹل سے مل کر رکھی تھی۔ یہاں ایک چبوترا تھا سامنے آسٹریلیا مسجد کی بلند و بالا عمارت تھی مگر وہاں کے متذبذب عقیدہ کے امام کے پیچھے سید محمد معصوم شاہ گیلانی نماز ادا کرنے سے ہچکچاتے تھے۔ اس چھوٹے سے چبوترے پر اپنے چند مخلص احباب سمیت نماز پڑھ لیتے اور پڑھا لیتے۔ آہستہ آہستہ چبوترا پھیلنے لگا۔ نمازی بڑھنے لگے نوری مسجد کے لیے پھیلتے پھیلتے دو کنال سے زیادہ (تینتالیس مرلے) زمین حاصل کر لی گئی قیمت ادا کر دی گئی اور لوگوں کے تعاون سے ۱۹۶۵ء تک مسجد مکمل ہو کر گنبد خضرا کی جھلکیوں سے نمازیوں کو دعوت سجدہ دینے لگی۔

سید محمد حسن شاہ نوری گیلانی نے اپنے والد گرامی کے ساتھ مل کر بلال گنج میں ایک اور نوری مسجد تعمیر کی۔ بلال گنج کے محلہ معصومیہ میں معصومیہ مسجد بنائی۔ بند روڈ کے ساتھ معصومیہ قبرستان بنایا۔ بند روڈ کے اس پار نوری مسجد بنوائی۔ پھر ساتھ ہی ایک غوثیہ مسجد تعمیر کرائی ہمارے مخدوم محترم حضرت گیلانی نے اپنے والد کی راہنمائی میں اللہ کے گھروں کو تعمیر کر کے اپنے لیے آخرت کے سامان بنا لیے ہمارے مخدوم سید محمد حسن نوری صاحب اس وقت بہتر سال (۱۹۳۰-۲۰۰۲ء) کے ہو چکے ہیں۔ اور ابھی تک بعض دینی مدارس اور مساجد کی تعمیرات میں شب و روز مصروف ہیں۔

حضرت پیر محمد حسن شاہ گیلانی کی ''مرکزی مجلس رضا'' سے سالہا سال سے وابستگی ان کی علمی اور اعتقادی پختگی کی علامت ہے۔ ابھی ہمارے یہ محترم مجلس میں بیٹھے ''یک فنجان چائے''۔ ختم نہ کرنے پائے تھے۔ کہ ڈاکیا آ گیا۔ خط آ گئے۔ لفافے آ گئے۔ رسالے آ گئے۔ پیغام آ گئے۔ سلام آ گئے۔

ع زاہد وفا کو بھول گیا اضطراب میں!

(''جہانِ رضا'' اپریل ۲۰۰۲ء)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے مُنّے مجلسی

مولانا مفتی محمد خاں صاحب قادری:

مرکزی مجلس رضا کے حجرے کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ کہ چند نوجوان آ پہنچے۔ یہ نوجوان مختلف شہروں سے آئے تھے۔ وہ مجلس کے ''ماہنامہ جہان رضا'' کے قارئین سے تھے۔ وہ مرکزی مجلس رضا کی علمی اور اشاعتی خدمات پر اظہار خیال کر رہے تھے۔ سلسلہ جاری تھا کہ حضرت مولانا مفتی محمد خاں صاحب قادری تشریف لے آئے۔ ان کا استقبال کیا اہل مجلس نے ان سے مصافحہ کیا ان کے ہاتھ میں ان کی تصنیف ''شرح سلام رضا'' کا تازہ ایڈیشن تھا۔ جسے دیکھ کر فاضل بریلوی کے دربار میں ان کی خدمات کی یادیں تازہ ہو گئیں۔ مفتی محمد خان صاحب قادری نے سلام رضا کی شرح ۱۹۹۳ء میں لکھی تھی۔ اس وقت تک اعلیٰ حضرت کے سلام رضا کی گونج چار دانگ عالم تک پھیل چکی تھی ہر مجلس نعت، ہر مجلس وعظ بڑے بڑے دینی جلسوں اور جلوسوں میں ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' کی دلنواز آوازیں ایمان کو تازہ کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کر چکی تھیں مگر کسی نے اس کی شرح پر قلم نہیں اٹھایا تھا۔ مفتی محمد خان صاحب قادری ایک کتاب ''شاہکار ربوبیت'' لکھ رہے تھے۔ اس پر جب وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے دیوان سے اشعار لاتے تو خود جھوم جھوم جاتے۔ خصوصاً اس کتاب میں انھوں نے جا بجا ''سلام رضا'' سے کئی اشعار مستعار لے کر اپنی کتاب کو شاہکار بنا دیا۔ انھوں نے اسی وقت عزم کر لیا کہ وہ ''شرح سلام رضا'' لکھیں گے۔ آپ کے اس ارادے کو جناب شمس بریلوی مرحوم، مولانا عبدالحکیم صاحب شرف، سید وجاہت رسول صاحب قادری اور مرکزی مجلس رضا کے نگران (راقم پیرزادہ اقبال احمد

فاروقی) نے تقویت دی اور آپ نے اس کتاب کو چھ سو صفحات پر مکمل کر کے دنیائے رضویت میں ایک مثال قائم کر دی۔

مفتی محمد خان قادری صاحب کا یہ کارنامہ مجلس میں بیٹھے ہوئے تمام حضرات نے پسند کیا ان میں سے بہت سے حضرات تو ''شرح سلام رضا'' پڑھ چکے تھے انھوں نے کھل کر دادِ تحسین دی۔ ''شرح سلام رضا'' کا پہلا ایڈیشن جون ۱۹۹۳ء میں چھپا۔ تو دنیائے رضویت میں تہلکہ مچ گیا ہر ایک عالم دین نے داد و تحسین سے نوازا۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری اور جناب شمس بریلوی جیسے ماہران رضویت نے بے حد تعریف کی۔ ''جہان رضا'' نے بھی اپنے مخصوص انداز میں تبصرہ کیا۔ پھر ہندوستان کے اکثر سنی علماء کرام نے بھی اسے پسند کیا اور مفتی محمد خان صاحب کو تعریفی خطوط لکھے۔ ہندوستان کے کئی ناشرین نے ''شرح سلام رضا'' کے انڈین ایڈیشن شائع کیے۔

مفتی محمد خان قادری نے بیٹھے بیٹھے فاضل بریلوی کی علمی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی اور اعلیٰ حضرت کی دینی بلندیوں کو اس انداز میں بیان کیا کہ مجلس میں بیٹھا ہر ایک مجلسی خوش ہو گیا۔ مفتی محمد خان صاحب قادری اگرچہ لاہور کے ایک دار العلوم کے مہتمم ہیں۔ جامع مسجد رحمانیہ شادمان کے خطیب اعظم ہیں ''کاروان اسلام'' کے سپہ سالار ہیں مگر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی علمی خدمات کے ترجمان ہونے کی بنا پر ہم انہیں مرکزی مجلس رضا کے ننھے مُنّے مجلسی شمار کر لیں تو یہ بات روایت کے خلاف نہیں ہوگی۔

مفتی صاحب نے بتایا کہ ''سلام رضا'' میں پچاس ایسے اشعار ہیں جو سید عالم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سراپا نگاری پر مشتمل ہیں مجھے ''شاہکار ربوبیت'' لکھتے وقت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے ان اشعار نے اتنا متاثر کیا کہ میری کتاب مکمل ہو گئی۔

مفتی صاحب ایک عرصہ تک ''فتاویٰ رضویہ'' کی ترتیب نو اور تدوین کے اس بورڈ کے چیئر مین رہے ہیں جسے ''رضا فاؤنڈیشن لاہور'' شائع کر رہی ہے چنانچہ آپ نے جلد پنجم سے آگے تیرہ جلدوں تک فتاویٰ رضویہ کو مرتب کیا۔ مرکزی مجلس رضا کے بانی

حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی فرمائش پر مفتی صاحب نے ''فتاویٰ خیریہ'' پر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے حواشی کا ترجمہ کیا تھا۔ ''اعلیٰ حضرت بحیثیت قاطع بدعات'' پر ایک مبسوط مقالہ لکھا جسے ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے اپنے مجلّہ میں شائع کیا۔

مفتی صاحب نے دوران گفتگو بتایا کہ وہ ان دنوں اعلیٰ حضرت کے ایک اور منظوم قصیدہ ''کروڑوں درود و سلام'' کی شرح لکھنے میں مصروف ہیں۔ ابھی مفتی صاحب کا سلسلۂ کلام جاری ہی تھا...... کہ ڈاک آ گئی۔ مختلف شہروں سے قارئین جہان رضا اور جہان امام احمد رضا کے خطوط آ گئے۔ نوازش نامے، یاد نامے، کرم نامے، محبت نامے اور نفاست نامے کھلنے لگے۔ ڈاک کیا آئی در معنیٰ کھل گیا بعض نفاست نامے نسیم جان بن کر آئے۔ بعض تنقید و تشریح لے کر آئے۔ ''داغ دہلوی'' نے کیا خوب کہا تھا۔

خط میں لکھے ہوئے رنجش کے پیام آتے ہیں
کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں

پروفیسر منیر الحق کعبی:

ہم نفاست ناموں پر نظر ڈال رہے تھے کہ مفتی محمد خاں قادری موقع غنیمت جان کر کھسک گئے۔ ابھی ان کے کھسکنے کی کسک ہمارے دل میں تازہ تھی کہ گجرات سے پروفیسر منیر الحق کعبی آ پہنچے۔ پروفیسر کعبی صاحب نے آتے ہی اپنی مسکراہٹوں سے مجلس کو باغ و بہار بنا دیا وہ اگرچہ شدید گرمی میں گجرات سے طویل سفر کر کے آئے تھے مگر ان کا چہرہ گل صحرا کی طرح ترو تازہ تھا۔ پانی کا گلاس نوش جاں کرتے ہی اپنے ممدوح اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر گفتگو کرنے لگے۔ حاضرین محفل نے اس جوان رعنا کو جس انداز سے امام احمد رضا کا ذکر کرتے سنا تو دل ہی دل میں محسوس کرنے لگے یہ بھی مجلس رضا کے ننھے مُنّے جلسی ہوں گے۔

پروفیسر منیر الحق کعبی ان دنوں زمیندار کالج گجرات میں پروفیسر ہیں اپنی تدریسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علمی اور روحانی نظریات سے لگاؤ کے سبب انہیں اپنے کالج

کے اساتذہ میں منفرد اور ممتاز مقام حاصل ہے وہ فاضل بریلوی کی شعری اور ادبی
تحریروں کو بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کرتے رہتے ہیں۔ چند سال قبل انہوں نے
اعلیٰ حضرت کی نعتیہ شاعری پر ایک ایسی کتاب...... لکھی جس نے پاک و ہند کی دنیائے
رضویت میں تہلکہ مچادیا۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت کے کلام کے محاسن کو بڑے علمی اور تحقیقی
انداز میں بیان کیا ساتھ ہی اعلیٰ حضرت کی شاعری پر کام کرنے والوں کو نشانۂ تنقید بنا
کر پہلی بار گلستان رضویت کے باغبانوں اور خیابان رضا کی بلبلوں کو للکارا۔ ان کے
قلم کی نوک سے بڑے بڑے اہل سخن اور اہل قلم کی تحریریں مجروح ہوئیں۔

؎ نگاہ کے تیر سے گر بچ گیا شکار کوئی
تو بڑھ کر زلف نے اس کو اسیر دام کیا

کعبی صاحب کو یہ کتاب لکھنے کی تحریک دراصل ہمارے دوست۔ نعت گو شاعر
نعت نویس، دانشور اور حسن کارکردگی کے قومی ایوارڈ یافتہ جناب بشیر حسین صاحب ناظم
ایم اے، ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل وزارت امور مذہبیہ پاکستان کی ایک تضمین پر ہوئی جو
سلامِ رضا پر لکھی گئی تھی۔ اور ماہنامہ ''جہان رضا'' میں چھپی۔ کعبی صاحب کو بشیر حسین
ناظم کے بعض اشعار پر اعتراض تھا۔ انہیں یہ بھی اعتراض تھا کہ ناظم صاحب نے اعلیٰ
حضرت کے کلام میں بعض الفاظ کو بدل دیا ہے۔ وہ جہان رضا میں ان مقامات پر تنقید
کرنے کی بجائے پوری کتاب ''تنقید نامہ'' تیار کرتے گئے پھر تضمین سلام رضا ہی
نہیں حدائق بخشش پر جتنے کام کرنے والے اہل قلم ہیں۔ ان کی مسامحات کے دفتر
کھولتے گئے۔

ان کا خیال ہے کہ اعلیٰ حضرت کی شاعری پر لکھنے والے اکثر قلمکار خصوصاً اعلیٰ
حضرت کی نعتوں پر تضمینیں لکھنے والے اہل علم بڑی بے اعتنائی سے قلم اٹھاتے ہیں اور
جو دل میں آیا لکھتے جاتے ہیں انھوں نے ایسے حضرات کے اس رویئے کو ''شاملات
دیہہ'' کی ایک دیہاتی اصطلاح سے تعبیر کیا۔ کعبی صاحب کی اس کتاب نے دنیائے

رضویت میں طوفان نہ سہی مگر ہر طرف ہلچل مچا دی۔ بہت سے اہل سخن نے کعبی
صاحب اور ان کے تنقیدی تیر و سنان کا نوٹس لیا۔ ہندوستان سے مفتی مطیع الرحمان
بہاری نے ''در جواب آں غزل'' ایک پوری کتاب...... لکھی جس میں پروفیسر کعبی کی
تنقیدی تحریروں پر گرفت کی اور شائع کر دی۔

وہ اس ادبی اور تنقیدی نوک جھونک کے بعد ایک عرصہ خاموش رہے۔ اور ہماری
بار بار خواہش کے باوجود اس موضوع پر دوبارہ قلم نہیں اٹھایا طویل خاموشی کے باوجود
وہ مجلس رضا کے مجلسی بن کر تشریف لاتے رہتے ہیں۔ وہ آج کی محفل میں بھی دنیائے
رضویت پر خوبصورت گفتگو کر رہے تھے۔ جس سے اہل مجلس خوش ہو رہے تھے۔ ان کی
خواہش ہے کہ اعلیٰ حضرت کے کلام کو بھرپور انداز سے لوگوں تک پہنچایا جائے۔

(''جہانِ رضا'' جون، جولائی ۲۰۰۲ء)

تحریکِ پاکستان کا ایک جان نثار سپاہی مولانا محمد بخش مسلم

پاکستان کی تشکیل سے دو سال قبل لوہاری دروازہ لاہور کے باہر ایک باغیچہ تھا جس کے ایک جانب پھول بیچنے والے پھول بیچتے اور ایک طرف چھوٹے چبوترے پر نمازِ جمعہ سے پہلے ایک خوش گفتار عالمِ دین خطاب فرمایا کرتے تھے۔ یہ تھے مولانا محمد بخش مسلم بی اے۔ مولانا مسلم ایک بے مثال مقرر تھے۔ جو اردو انگریزی میں یکساں خطاب کیا کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی پاکستان کے حامی لوگ جوق در جوق ان کی تقریر سننے آتے اور باغ کے گھنے درختوں کے نیچے ایک دینی اور سیاسی مجمع لگ جاتا۔ جن میں نوجوانوں کی اکثریت ہوتی۔ خصوصاً کالجوں کے طلبہ اور عدالتوں کے نوجوان وکلا مولانا مسلم کی تقریر سننے دور دور سے آتے۔

ہم ان دنوں کالج کے طلبہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس باغیچے میں پہنچے جہاں آج مسلم مسجد کا فلک بوس مینار تحریک پاکستان کی یادوں کو تازہ کر رہا ہے۔ ہم مسجد کی طرف آ رہے تھے ہم نے دیکھا کہ ایک خوبصورت عالمِ دین سر پر ترکی ٹوپی پہنے پاکستان کے قیام پر نہایت مدلل طریقے سے خطاب کر رہا ہے وہ لوگوں کو پاکستان کی حمایت کے لیے پکار رہا تھا اور لوگوں کو غلامی کی مایوسیوں کے اندھیروں سے نکلنے کی جدوجہد میں شریک ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔ ہم نے اس کی مترنم آواز میں یہ اشعار سنے:

شبِ ہجراں کے جاگنے والو! — کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی؟
رہ گئی بات، کٹ گئی شبِ ہجر — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟

وہ فرما رہے تھے۔ آزادی کی شبِ ہجراں گزارنے والو! اور پاکستان کے لیے

ں دینے والو! اگر ملک آزاد نہ ہوا اور پاکستان نہ بنا تو تم کیا کرو گے؟ پھر زور دے رماتے۔ غلامی کی سیاہ رات ختم ہونے والی ہے۔ شبِ ہجراں صبحِ آزادی میں ل ہونے والی ہے۔ یہ شبِ ہجر کٹ جائے گی اور صبحِ آزادی کی روشنیاں ضرور یں گی اور پاکستان بن کر رہے گا۔

ہم نوعمر طالب علم تھے۔ مولانا مسلم کی تقریر میں قائدِ اعظم محمد علی جناح کی تقاریر کے انگریزی جملے سنتے۔ تحریکِ پاکستان پر دلائل سنتے تو دل میں جذبات کے سمندر ڈتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے ہندو رہنما پوری قوت سے پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور قائدِ اعظم کے خلاف اپنی تمام توانائیاں رف کر رہے تھے۔ مگر لاہور کی اس چھوٹی سی مسجد کا یہ خطیب قائدِ اعظم کے اقوال سنا کر علامہ اقبال کے اشعار پڑھ پڑھ کر اپنے سامعین کو تحریکِ پاکستان کا ہمنوا بنا رہا ۔ آج بہت سے لوگ پاکستان کے موجودہ حالات میں ایسے کھو گئے ہیں کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں رہا کہ تشکیلِ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں میں مولانا محمد بخش مسلم کی خدمات کا کیا مقام ہے۔

مولانا محمد بخش مسلم ۱۸ فروری ۱۸۸۸ء کو قدیم لاہور کے ایک گنجان محلہ چھتہ بازار میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسمِ گرامی پیر بخش تھا۔ آپ کا سارا خاندان شرقپور شریف کے میاں شیر محمد شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدت مند تھا۔ مولانا مسلم نے سات سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ مشن ہائی سکول رنگ محل لاہور سے میٹرک کیا۔ ممتاز عالمِ دین مولانا غلام مرشد صدر مدرس دار العلوم نعمانیہ اور مولانا اصغر علی روحی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور سے دینی علوم کا مطالعہ کیا۔ ۱۹۱۱ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا ۱۹۱۳ء میں فاضل عربی میں کامیابی حاصل کی۔ مولانا مسلم کو انگریزی ادب میں علامہ احسان اللہ ملک اور پروفیسر احسان اللہ شاہجہانپوری سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ ان دنوں لاہور کے دینی مدارس میں دار العلوم نعمانیہ درس وڈا میاں (مغلپورہ) مدرسہ حمیدیہ (نیلا گنبد)

دارالعلوم فتحیہ (اچھرہ) کے اساتذہ سے بھی رہنمائی حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا اور بی اے ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ وہ تقریر وتحریر میں باکمال مقرر اور ادیب بن کر ابھرے۔ انہیں حضرت علامہ اقبال کی مجالس میسر آ گئیں اور مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ زمیندار میں مکالمہ نویسی کا موقع ملا۔

تحریکِ پاکستان چلی تو ملک کے دینی اور سیاسی رہنما دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ علمائے دین کا ایک طبقہ نیشنلسٹ علماء بن کر گاندھی اور نہرو کا ہمنوا بن گیا اور تحریکِ پاکستان کے خلاف کام کرنے لگا۔ سیاسی رہنماؤں میں تحریک خلافت، مجلس احرار اسلام، خاکسار تحریک، جمعیت علمائے ہند کے رہنما پاکستان کے خلاف میدان میں نکلے مگر ان کے برعکس مولانا محمد بخش مسلم ان علماء کی صف میں کھڑے تھے جنہوں نے پاکستان کی حمایت میں علامہ اقبال کی فکر اور حضرت قائداعظم کے عزم کی ہمنوائی کی تھی۔ ان علماء کرام میں مولانا حسرت موہانی، مولانا عبدالحامد بدایونی، نواب بہادر یار جنگ، علامہ علاء الدین صدیقی پیر آف مانکی شریف، پیر جماعت علی شاہ علی پوری، پیر آف زکوڑی شریف، سندھ کے پیر آف بھر چونڈی شریف اور خانوادہ امام احمد رضا کے تمام سنی علماء کرام تحریکِ پاکستان کے ہمنوا تھے۔ مولانا مسلم انہی علماء کے کاروان میں شریکِ سفر تھے۔

پاکستان میں آج اکثر ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے مولانا مسلم کی تحریک پاکستان کی جدوجہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ بمبئی سے لے کر صوبہ سرحد تک تمام شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور قریوں میں گئے اور اپنے خطابات سے لوگوں کو تحریک پاکستان سے آشنا کیا۔ بمبئی اور جنوبی ہند کے اکثر علاقوں میں آپ نے انگریزی میں تقریریں کیں۔ یوپی اور پنجاب کے علاقوں میں اردو اور انگریزی میں تقریریں کیں پھر پنجاب کے دیہات میں پہنچے تو پنجابی میں ''بابا قائداعظم'' سے لوگوں کو متعارف کرایا۔ وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں صفِ اوّل کے مقررین میں شمار ہوتے تھے۔

آج زمانہ مولانا محمد بخش مسلم جیسے عالمِ دین کو بھول گیا ہے دولت کی لوٹ کھسوٹ میں آزادیٔ وطن کے لیے کام کرنے والوں کے نام تک بھلائے جا رہے ہیں۔ ورنہ مولانا مسلم نے جو کام کیا ہے وہ پاکستان کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جانے والا ہے۔ آزادی کے بعد لوگ کوٹھیوں اور زمینوں کی الاٹمنٹ میں لگ گئے کارخانوں اور ملوں کے حصول میں مصروف ہو گئے دولت کی ریل پیل میں ان لوگوں کو بھلاتے گئے جن کے خون سے پاکستان کا پودا پروان چڑھا تھا۔ ان تمام تماشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے مولانا محمد بخش مسلم اپنے چھوٹے باغیچے میں خطاب کرتے رہے۔ ایک وقت آیا کہ ان کی کوششوں سے لوہاری دروازہ لاہور کے باہر اس باغیچہ میں مسلم مسجد جیسی عظیم الشان مسجد بنی اور آج اس کے محراب ومنبر مولانا مسلم کی قومی اور ملی خدمات کی شہادت دے رہے ہیں۔ مولانا مسلم نے تشکیلِ پاکستان سے لے کر تا دمِ رحلت دین کی خدمات سرانجام دینے میں زندگی وقف کر دی۔ کاش مولانا مسلم کی دینی اور سیاسی خدمات کا اعتراف کیا جاتا۔ تحریکِ پاکستان میں ان کی جدوجہد کا ذکر آتا۔ پاکستان بنانے والوں میں ان کی خدمات کو سراہا جاتا۔ پاکستان کے اقتدار کے ایوانوں میں بیٹھنے والے ایسے پرعزم رہنماؤں کو یاد رکھتے مگر ہائے زمانہ کی بے مہری!

نیرنگی سیاست دوراں تو دیکھیے   منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے!

(روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۲۹ مئی ۲۰۰۲ء)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے مُنّے مجلسی

پچھلے ہفتے ہماری محفل جمی ہوئی تھی کہ ایک شخص جہانیاں منڈی ضلع خانیوال سے چل کر لاہور آیا اور ہماری مجلس میں آ پہنچا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے اپنے سفر کی روداد سنانا شروع کی۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے نظریات سے وابستگی پر گفتگو کرنے لگا پھر مرکزی مجلس رضا کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری سے اپنے تعلقات پر روشنی ڈالنے لگا۔ اس کی باتیں دلچسپ بھی تھیں اور دلنشین بھی۔ مگر اس نے جب والہانہ انداز میں مرکزی مجلس رضا کی خدمات پر اظہار خیال کرنا شروع کر دیا تو ہمیں اچھا لگا۔ پھر اس نے بتایا کہ میں سابقہ گیارہ سال سے جہان رضا کا مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں مجھے اس کی تحریریں پسند آتی ہیں مضامین دلنشین ہوتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی پر اہل قلم وعلم کے مقالات پڑھتا ہوں تو دل خوش ہو جاتا ہے۔

خلیل احمد رانا:

ہمارے یہ مجلسی خلیل احمد رانا تھے جو جہانیاں منڈی سے چل کر افتاں و خیزاں صرف اس لیے لاہور پہنچے تھے کہ وہ مرکزی مجلس رضا کے مجلسی بن کر ہمارے ساتھ علمی اور عملی تعاون کریں گے۔ انھوں نے کہا اب وہ یہاں ہی رہیں گے ''جہان رضا'' کے مضامین کو ترتیب دیں گے۔ اس کی طباعت اور اشاعت کے مراحل میں ہاتھ بٹائیں گے پروف ریڈنگ کر کے جہان رضا کو پریس میں بھیجیں گے چھپوائیں گے رسالہ تیار ہونے پر قارئین جہان رضا کو ترسیل کریں گے۔ تمام قارئین کے پتے اپنے ہاتھ سے لکھیں گے اور نام و پیام لکھتے وقت ''جہان رضا'' کے ایک ایک قاری کو سلام کہیں گے۔ دفتر میں آ کر بدست خود جہان رضا حاصل کرنے والوں کے ساتھ واقفیت حاصل کریں

گے۔ اس طرح ایک ایک معاون سے تعارف حاصل کریں گے۔ جہان رضا کے ایڈیٹر کے بوجھ کو اپنے سر لے کر چھوڑیں گے۔

اس ننھے منھے مجلسی خلیل رانا آف جہانیاں منڈی کے جذبہ کو تمام حاضرین مجلس نے سراہا۔ خود ایڈیٹر جہان رضا نے ان کی اس پیشکش پر خوشی کا اظہار کیا خلیل احمد رانا حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے عاشقوں میں سے ہیں۔ تیس سال سے زیادہ عرصہ گزرا انہیں مرکزی مجلس رضا سے تعلق خاص رہا ہے بانی مجلس حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے رفیق علم و قلم رہے ہیں اور ان کی تالیفات اور تصانیف کو حکیم صاحب نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے خلیفہ قطب مدینہ مولانا ضیاء الدین احمد قادری مدنی کا مدینہ منورہ میں انتقال ہوا تو حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے مولانا ضیاء الدین احمد پر ایک مبسوط کتاب مرتب کرنے کا اعلان کیا۔ تو آپ کی نگاہ نے خلیل احمد رانا کو منتخب کر کے اس عظیم کام کے لیے آمادہ کیا رانا صاحب نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ''انوار قطب مدینہ'' مرتب کی جو چھ سو صفحات پر مشتمل تھی جسے ''مرکزی مجلس رضا'' نے نہایت خوبصورت انداز میں زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ کر کے پاکستان اور بیرون پاکستان کے اہل محبت کے ہاں اعزازی طور پر پیش کیا۔ خلیل احمد رانا صاحب کا یہ کارنامہ دنیائے رضویت میں ہمیشہ تحسین کی نظروں سے دیکھا گیا اور علمائے کرام نے بہت تعریف کی خلیل احمد رانا ایک مخلص صاحب قلم و تحقیق دانشور ہیں جنہوں نے کئی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ''جہان رضا'' کے صفحات پر اپنے تحقیقی مقالات شائع کرا کر اہل محبت کو دعوت مطالعہ دی ان کے پاس بے شمار مشاہیر اہل سنت کے خطوط موجود ہیں جن میں بانی مجلس حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے ایسے تین سو خطوط موجود ہیں جو حکیم صاحب کی ''مرکزی مجلس رضا'' کی تنظیمی جدوجہد پر روشنی ڈالتے ہیں۔

ہمارے آج کے مجلسی رانا خلیل صاحب جہانیاں منڈی کے ایک متوسط زمیندار ہیں۔ زراعت پر روزی کا دارومدار ہے مگر علمی کھیتوں کی آبیاری میں زندگی کے طویل

شب و روز گزارتے ہیں۔ ان کا علمی حلقہ بڑا وسیع ہے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کے
ترجمان ''جہان رضا'' کے صفحات پر ان کے عمدہ مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ اور
سارے برصغیر پاک و ہند کے حلقۂ رضویت کے جانے پہچانے دانشور ہیں۔ انھوں
نے اپنے علمی ذوق کی تشنگی کو سہارا دینے کے لیے جہانیاں منڈی میں ''نعمان اکیڈمی''
کی بنیاد رکھی جس کے فورم سے بڑا علمی کام کیا۔

اب وہ جہانیاں سے چل کر لاہور آئے ہیں۔ ہمارے ننھے منّے مجلسیوں کے
اجلاس میں شرکت کی ہے ہمارے ساتھ علمی و عملی تعاون کرنے پر بضد ہیں۔ اور اصرار
کرتے ہیں کہ جب تک آپ اپنے کندھوں پر تھکا دینے والا بوجھ میرے سر پر نہیں
رکھیں گے۔ میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ ''جہان رضا'' کی جیم سے الف تک کی
ساری خدمات میں سرانجام دوں گا۔ میں پڑھوں گا۔ میں لکھوں گا میں پریسوں میں
جاؤں گا۔ ایڈریس لکھوں گا۔ ڈاک خانے میں جاؤں گا۔ ایسے ننھے منّے مجلسی کو کس
طرح ٹالا جائے۔ کس طرح بہلایا جائے۔ کن الفاظ میں شکریہ ادا کیا جائے۔ کن الفاظ
میں ان کے جذبے کی تعریف کی جائے۔ کس انداز میں اپنے سینے میں محفوظ کیا جائے۔

وہ کمسن ہیں! ضدی ہیں نرالی ان کی!
اس پہ مچلے ہیں کہ وہ ''جہان رضا'' چھاپیں گے

خلیل رانا نے ہمیں خوش کر دیا۔ ہماری دعاؤں کے سیلابوں کا رخ اپنی طرف
موڑلیا۔ اب آپ فیصلہ کریں جب مرکزی مجلس رضا کے ایسے ننھے منّے مجلسی موجود ہوں
تو ہمیں کیا فکر ہو سکتی ہے۔ یہ مرکزی مجلس رضا کی خدمات کا صلہ ہے۔ ''جہانِ رضا''
کی تحریروں کے ثمرات ہیں کہ ایسے ایسے اہل قلم، اہل محبت پھولوں کو چن چن کر اپنی
جھولیاں بھرتے رہتے ہیں۔ جو ہم ''جہان رضا'' کے صفحات پر بکھیرتے رہتے ہیں۔

اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

اڑالی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری

جناب خلیل احمد رانا ابھی میر محفل بنے ہوئے تھے کہ ڈاک آگئی۔ یہ ڈاک سپیشل
ڈاکیا لایا تھا جس نے ایک بہت بڑا لفافہ دیا کھولا تو ہمارے دوست علامہ کوکب نورانی
صاحب کا ایک جگمگاتا ہوا مضمون جلوہ گر ہوا۔ علامہ کوکب نورانی جب کرم فرماتے ہیں
تو سپیشل ڈاک سے پیغام رسانی کرتے ہیں رات کراچی کی فوری ڈاک میں خط دیا ''علی
الصباح چو مردم بہ کاروبار روند'' لاہور پہنچ گیا ابھی ہم چند سطریں پڑھنے پائے ہی تھے۔
کہ ایک اور فوری ڈاک آگئی یہ جناب سید وجاہت رسول صاحب قادری ''صدر ادارۂ
تحقیقات امام احمد رضا کراچی'' کا نفاست نامہ تھا اور ساتھ ہی ایک خوبصورت ''مجلہ
امام احمد رضا سالانہ کانفرنس کراچی'' جلوہ فرما ہوا۔ اس مجلہ میں ادارہ تحقیقات امام احمد
رضا کراچی کی علمی امور کی تفصیلات تھیں جسے دنیائے رضویت نہایت عقیدت سے
پڑھتی ہے۔ یہ دونوں لفافے اہل مجلس کے لیے ''مٹھائی کے ڈبے'' بن کر سامنے آئے
جسے ہر مجلسی بلا اجازت اٹھا کر پڑھتا رہا۔

ابھی ہماری نگاہیں ان آنے والے ''شیریں اوراق'' کو ذوق نظر سے دیکھ ہی رہی
تھیں کہ کسٹم کے محکمہ کا ایک رضوی انسپکٹر آپہنچا۔ ایک بنڈل پیش کیا۔ اس میں ممبئی
(انڈیا) سے چھپنے والے ''افکار رضا'' کے پرچے تھے۔ کسٹم کے محکمہ کا یہ رضوی انسپکٹر
بھی مرکزی مجلس رضا کا دیرینہ مجلسی ہے۔ انڈیا سے جب ایسی ڈاک آتی ہے جس میں
اعلیٰ حضرت کی خوشبو ہو تو ڈاکیئے کی بجائے خود آتا ہے اور ''رضویت کا نامہ بر'' بن کر
ہمیں خوش کر دیتا ہے۔

افکار رضا (ممبئی) کیا آیا دفتر معنی کھل گیا۔ محمد زبیر قادری سے کون رضوی عالم
دین واقف نہیں ان کی تحریروں کا کون منتظر نہیں رہتا؟ بنڈل کھلا تو سب حاضرین کے
ہاتھ بڑھے ہم بھی مشتاقان دید کے مجمع میں بیٹھے تھے۔ افکار رضا کھولا۔ محمد زبیر قادری

صفحہ صفحہ پر جلوہ گر دکھائی دیے اداریہ پڑھا عالم اسلام کے مسائل حاضرہ کا تجزیہ تھا۔
دعوت اسلامی ممبئی کے سالانہ اجتماع کی روداد سامنے آئی ڈاکٹر صابر سنبھلی صاحب،
ایچ پی جی کالج، مراد آباد کا ''ترجمہ کنزالایمان کا لسانی جائزہ'' پڑھا۔ پھر شیخ الاسلام
حضرت سید محمد مدنی میاں اشرفی الجیلانی کے قلم سے اعلیٰ حضرت کے ایک شعر کی ترجمانی
نے دعوت مطالعہ دی۔ علامہ کوکب نورانی (کراچی) کے قلم سے نجدی وہابیوں کی ایک
کتاب ''امام العصر'' پر زبردست تبصرہ سامنے آیا۔ علامہ محمد عبدالحکیم خاں شاہجہاں
پوری مرحوم کی قلمی خدمات پر ایک تحقیقی مضمون نے خوش کام کیا۔ نوری مشن، مالیگاؤں
کے معروف اہل قلم مولانا غلام مصطفیٰ رضوی صاحب نے اپنے شہر مالیگاؤں میں
رضویت کی فضا کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی بریلی صاحب کا مضمون ''امام
احمد رضا اور ڈاکٹر علامہ اقبال'' ایک خوبصورت تحریر سامنے آئی علامہ محمد سراج الدین
شریفی سہسرامی (بہار) نے ہمارے علمائے کرام کی تبلیغی کوتاہیوں پر زبردست مقالہ لکھا۔

جناب محمد زبیر قادری ۱۹۹۹ء میں پاکستان آئے تو اپنی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے
قلم برداشتہ سفرنامہ لکھا جسے بڑی دلچسپی سے پڑھا گیا اور حقیقت ہے کہ

ع دل وجاں وجد کناں جھک گئے بہر تعظیم!

محمد زبیر قادری صاحب اگرچہ ممبئی انڈیا میں قیام پذیر، ہیں مگر وہ ''مرکزی مجلس
رضا پاکستان کے ننھے منے مجلسی ہیں''۔ اگر آپ انہیں دیکھ لیں تو کہیں گے کہ واقعی وہ
''ننھے منے مجلسی'' ہیں۔ آج سے دس سال قبل ہم جہان رضا کے چند شمارے اجمیری
بک ڈپو ممبئی کو ہر ماہ بھیجا کرتے تھے۔ محمد زبیر قادری صاحب ہر ماہ ان سے جہان رضا
لیتے مطالعہ کرتے ایک دن انھوں نے اپنی خوشی کا برملا اظہار کرتے ہوئے ہمیں خط
لکھا۔ گویا کہہ رہے ہیں: ''I Love You'' خط پڑھا۔ دل خوش ہو گیا کہ ایسے لوگ
بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں موجود ہیں۔ جواب لکھا تو سلسلۂ خط کتابت جاری ہو گیا۔
انہیں ''جہان رضا'' اتنا پسند آیا۔ کہ وہ چشم براہ رہتے انھوں نے ''تحریک فکر رضا'' کی

اور کھی۔ اور فروغ افکار رضا پر کام کرنے لگے۔ انہیں ''جہان رضا'' کا انداز بے حد پسند
تھا اسی انداز میں ''سہ ماہی افکار رضا'' نکالا۔ پہلا شمارہ چھپا۔ ہندوستان بھر کے علمائے
کرام کو اعزازی پہنچایا گیا بعض علمائے کرام نے حیرت کا اظہار کیا بعض نے حوصلہ افزائی
کی۔ ''افکار رضا'' پاکستان پہنچنے لگا تو ہم نے یہ جانا کہ یہ ''جہان رضا'' کا عکس جمیل
ہے پاکستانی علماء نے پسند کیا۔ ہندوستان کے گوشے گوشے سے خط آنے لگے۔ ادھر
''افکار رضا ممبئی'' کی ترتیب پر جناب محمد زبیر قادری نے بڑی محنت کی اور رسالہ تیار
کرنا شروع کیا۔ عام رسالوں کی روش سے ہٹ کر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا پر علمی
تحقیقی اور معلوماتی مضامین آنے لگے ''افکار رضا'' کے صفحات نے جس تخصص سے
پیغام رضا پہنچایا اس سے

ع گونج گونج اٹھے ہیں ''افکار رضا'' سے بوستان!

کا سماں بندھ گیا۔ اداریہ، مضامین، رضا نامہ، اہل علم کے خطوط چھپنے لگے۔ سارا ہندوستان
رضا کے نغمات سے گونجنے لگا۔ وہ چند رسالے پاکستان بھیجتے تو اہل محبت ہاتھوں ہاتھ
لیتے اور محبت سے مطالعہ کرتے۔

پیغام رضا کو خصوصیت سے ''افکار رضا'' نے داہنے دامن میں لپیٹ کر سارے
ہندوستان میں پھیلانا شروع کر دیا۔ اہل علم نے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اعلیٰ حضرت
فاضل بریلوی کے عاشقوں نے رسالے کی تلاش شروع کر دی۔ کیرالہ سے لے کر
سری نگر کی وادیوں تک ''افکار رضا'' پہنچنے لگا۔

''افکار رضا'' کے ایڈیٹر محمد زبیر خان قادری نے ''مرکزی مجلس رضا'' کی خدمات
کو بے حد پسند کیا۔ اس کی خدمات کو سراہا۔ ''جہان رضا'' سے بے حد متاثر ہوئے۔
بذات خود صرف اور صرف ''مرکزی مجلس رضا'' کو دیکھنے کے لیے دو تین بار ممبئی سے
لاہور آئے۔ مرکزی مجلس رضا کے ''ننھے منے مجلسی'' نے مجلس کی خدمات کو ہمیشہ خراج
تحسین پیش کیا۔ ''جہان رضا'' کے ایڈیٹر کی خدمات کو خوش کن الفاظ میں سراہا۔ اس

سے بڑھ کر ہر ماہ ''جہان رضا'' کے کم وبیش ساٹھ رسالے منگوا کر ہندوستان کے اہل علم میں تقسیم کرنا شروع کر دیئے۔ ان کی اس مسلسل کوشش سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں جہان رضا پھیلنے لگا۔ وہ ایسے مقامات تک جہان رضا پہنچاتے ہیں جہاں تک ہماری رسائی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ مرکزی رضا کے اس ''ننھے مُنّے مجلسی'' کو عمر خضر عطاء فرمائے اور زندگی بھر پیغام رضا سے دلوں کو منور کرتے رہیں۔!

(''جہانِ رضا'' اگست ۲۰۰۲ء)

علماء کرام کی یادیں......مجلسی لطائف کی روشنی میں

علماء کرام نے اپنی علمی اور فقیہانہ کوششوں سے اپنے اردگرد کے ماحول کو اسلامی افکار سے روشناس کرانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی زندگیاں دین اسلام کی خدمت میں وقف رہی ہیں۔ اور وہ شب و روز عوام کو دعوتِ فکر دیتے رہے ہیں۔ دینی امور کی رہنمائی کے ساتھ وہ اپنی مجلسی زندگی میں بڑی لطیف گفتگو کرتے تھے۔ اس میں شگفتگی بھی ہوتی اور نکتہ آفرینی بھی یہ نکتہ آفرینی بعض اوقات سٹیج پر بھی سامنے آیا کرتی تھی۔ ہمیں یہ سعادت حاصل رہی ہے کہ جہاں ہم نے عام جلسوں میں علماء اہلِ سُنّت کے خطبات سے اپنا حصہ پایا اور ان کے تدریسی حلقوں سے خوشہ چینی کی وہاں ان کی نجی اور خصوصی مجالس سے بھی گلہائے رنگا رنگ سمیٹے۔

موچی دروازے کے باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہو رہا ہے۔ یہ جلسہ ''اتحاد بین المسلمین'' کے نام سے منعقد ہوا تھا۔ یہ ۱۹۶۲ء کا واقعہ ہے۔ جب بعض ''اتحادی علماء'' نے سنی، شیعہ، دیوبندی، احراری، خاکساری اور جماعت اسلامی کے مقررین کو ایک اسٹیج پر بٹھا دیا۔ ایسی ''بے معنی'' کوششیں ہر دور میں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر نہ ''اتحاد بین المسلمین'' ہوتا ہے اور نہ ''اتحاد بین العلماء'' ہوتا ہے۔ اس جلسہ میں ہر فرقے کے شعلہ بار مقرر آئے ہوئے تھے۔ ایک شیعہ راہنما علامہ مظفر علی شمسی (م:۶-۷-۶-۱۹) دھواں دار تقریر کر رہے تھے۔ وہ تقریر کے دوران قیامت کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ اور جہنم کی خوفناکیوں کا نقشہ پیش کر رہے تھے۔ معاً انہیں میدانِ کربلا یاد آ گیا۔ تو انہوں نے اپنے خطاب کا رخ موڑ کر دریائے فرات کے کنارے معصومانِ کربلا پر مظالم کا ذکر شروع کر دیا۔ دس منٹ میں انہوں نے اس دردناک انداز میں مصائب

اہلِ بیت کا تذکرہ کیا کہ مجمع میں بیٹھے ہوئے بہت سے شیعہ حضرات یا حسین! یا حسین! یا حسین! کہہ کر رونے لگے۔ اور جلسے میں ایک کہرام مچ گیا۔ اب فاضل مقرر اپنے سابق موضوع پر لوٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر انہیں یاد نہ رہا کہ وہ سلسلہ بیان کہاں چھوڑ کر آئے ہیں۔ انہوں نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں کہاں تھا؟'' کسی نے جواب نہ دیا۔ تو شمسی صاحب نے پرزور الفاظ میں دوبارہ للکارا '' میں کہاں تھا؟'' جب کوئی جواب نہ آیا تو مولانا محمد بخش مسلم مرحوم اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ بول کر فرمانے لگے۔ ''آپ جہنم کے کنارے پر تھے''۔ شمسی صاحب نے کہا ہاں ہاں میں جہنم کے کنارے پر کھڑا تھا۔ مسلم صاحب نے میرا بازو پکڑ کر کھینچ لیا سارے مجمع میں ایک خوشگوار قہقہہ بلند ہوا پھر شمسی صاحب دوبارہ گرجے اگر ہم شیعہ سنی ایک ہو جائیں ''اتحاد بین المسلمین'' ہو جائے تو ہم جہنم میں گرنے سے بچ جائیں گے۔

مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۰-۱۰-۹):

بڑے عالم، منطقی اور قادر الکلام خطیب تھے وہ مجمع میں کھڑے ہوتے تو اپنی خوش بیانی اور شیریں زبانی سے مجمع پر چھا جاتے۔ ''دار العلوم نظامیہ'' لوہاری دروازہ لاہور کی دعوت پر ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرنے آئے۔ لاہور کے علماء اور اہلِ علم و فضل بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مولانا ہزاروی کا خطاب موسلا دھار بارش کی طرح چھایا ہوا تھا۔ آپ نے اپنے خطاب میں لفظ ''تجلّی'' بولا۔ مجمع میں سے ایک بابا اٹھا بلند آواز سے بولا مولانا لفظ ''تجلی'' ہے ''تجلّی'' نہیں۔ مولانا رک گئے کہنے لگے ''بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی''۔ اور فرمایا ''فلما تجلّی'' تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ پھر بولے:

تجلّی تیری ذات کا سو بسو ہے!

لیکن بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ پھر فرمایا:

بدو گفت سالار بیت الحرام — کہ اے حاملِ وحی برتر خرام
چو در دوستی مخلصم یافتی — عنانم ز صحبت چرا تافتی؟

بگفتا فراتر مجالم نہ ماند — بماندم! کہ نیروے بالم نہ ماند
اگر یک سرے موئے برتر پرم — ''فروغ تجلّی'' بسوزد پرم

آپ نے سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے یہ شعر ترنم سے پڑھے سارا مجمع جھوم گیا پھر بابے کو کہا: بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی''۔ وہ دیکھو علامہ اقبال کی روح مکان کی چھت پر کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔

بے تجلّی مرد دانا رہ نبرد — از لکد کوب خیال خویش مرد
بے تجلّی زندگی رنجوری است — عقل مہجوری و دین مجبوری است

لیکن تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ پھر سنو: علامہ اقبال کی روح جاتے جاتے رک گئی اور آواز آئی:

یہ بزم تجلّی ہاست بنگر؟

بابا تیری تجلی اور میرا تجلّی۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی نے بیس بار تجلّی کا لفظ استعمال کیا اور ہر موقع پر آیات، احادیث اور اشعار سے دلیلیں لاتے رہے۔ مجمع سرور میں ڈوبا رہا اور ''تجلی والا بابا'' خدا معلوم کدھر چلا گیا۔

مولانا محمد شریف نوری قصوری رحمۃ اللہ علیہ (م: ۷۲-۵-۱۳):

ہمارے مخلص احباب میں سے تھے۔ حضرت مولانا نور اللہ نعیمی بصیر پوری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اپنے وقت کے شیریں بیاں مقرر تھے۔ ان کی خوش آوازی دلوں کو سکون بخشتی تھی۔ ان کی دل سوز آواز دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی تھی۔ وہ پاکستان کے دور دراز شہروں اور قصبوں میں بلائے جاتے تھے اور اپنے بیان و کلام سے دلوں کو روشن کرتے جاتے تھے۔ نواب آف کالا باغ ابھی گورنر نہیں بنے تھے۔ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ مولانا محمد شریف نوری محرم الحرام کے جلسہ میں کالا باغ آئیں اور تقریر کریں۔ نواب آف کالا باغ کے بھائی نواب خاں اور ان کے کزن شیر محمد خان اعوان (مولف ''محاسنِ کنز الایمان'') لاہور آئے مولانا محمد شریف نوری اور

مولانا محمد بخش مسلم مرحوم کو کالا باغ لے گئے۔ دونوں نامور خطیب تھے۔ جلسہ گاہ میں
دور دور سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ مولانا مسلم مرحوم بتاتے ہیں کہ مولانا نوری نے
کربلا کے واقعات کو بڑے پرسوز انداز میں بیان کیا اور مبالغہ آرائی سے کام لیتے
ہوئے فرمایا: ''حضرت عباس علمدار میدانِ کربلا میں نکلے۔ سامنے یزیدی فوج
دریائے فرات پر پرے باندھے کھڑی تھی حضرت عباس کے ہاتھ میں ''ذوالفقارِ علی''
تھی۔ ہزاروں یزیدی حضرت عباس پر ٹوٹ پڑے اور آپ کو گھیرے میں لے لیا۔
حضرت عباس نے تلوار کا دایاں ہاتھ مارا دس ہزار یزیدی کٹ گئے۔ بایاں ہاتھ مارا تو
دس ہزار یزیدی واصلِ جہنم کر دیے۔ ایک شقی القلب یزیدی نے دور سے ایک ایسا
تیر مارا کہ حضرت عباس کی پیشانی سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ پھر نوری صاحب نے
زور دے کر کہا: لوگو یہ وہ پیشانی تھی جسے شہیدِ کربلا حضرت امام حسین نے چوما تھا۔ یہ وہ
پیشانی تھی جسے حضرت زینب نے چوم کر اجازت دی تھی۔ مولانا نوری نے اس یزیدی
کے تیر اور پیشانی سے خون کے فوارے کی بات اس دردناک انداز میں کی کہ مجمعے میں
کہرام مچ گیا اور کئی دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مولانا مسلم کہتے ہیں کہ اسٹیج پر بیٹھے
ہوئے ایک شخص نے میرے کان میں کہا اُن کا بیس ہزار آدمی مار دیا۔ کوئی نہ رویا ایک
تیر لگا تو سارا مجمع رونے لگا۔ میں نے کہا چپ رہو! یہ بات باہر جا کر کہنا ورنہ مارے
جاؤ گے۔

مولوی نور محمد ایمن آبادی:

پیپلز پارٹی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ملیں قومیائی جا رہی تھیں۔ کارخانوں میں
مزدور قابض ہو رہے تھے۔ کارخانوں کے مالکوں کے منہ کالے کر کے ذلیل و خوار کیا
جا رہا تھا۔ پیپلز پارٹی کے جیالے جگہ جگہ قبضے کر رہے تھے۔ لوگ بڑے تنگ آئے
ہوئے تھے۔ ہر طرف ''ہے جمالو'' کے نعرے تھے۔ ''دما دم مست قلندر'' کے بھنگڑے
تھے۔ کوئی بات نہیں کر سکتا تھا۔ جیالوں کے طوفان کو کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ ایمن آباد

کے ایک مولوی نور محمد تھے۔ سنار تھے۔ مگر ان کی آواز میں بڑا درد تھا۔ بڑا سوز تھا۔ وہ
لاہور کے بھاٹی دروازہ کے باغ میں مسندِ وعظ بچھاتے تھے۔ نہایت سریلی آواز میں
وعظ کرتے اور شعر سناتے۔ آپ کے مجمع میں عام طور پر لاہور کے گنجان محلوں میں بسنے
والی خواتین آتیں۔ اور آپ کا وعظ سنتیں۔ ان مستورات کو اجازت تھی کہ وہ مجلس وعظ
میں بیٹھی بیٹھی گھر کے لیے سبزی تیار کرتی جائیں۔ سوئیٹر بنتی جائیں۔ جرابیں بناتی
جائیں۔ کپڑے سیتی جاتیں۔ حتیٰ کہ اپنے بچوں کو بیٹھے بیٹھے دودھ بھی پلاتی جائیں مگر
فاضل مقرر بلا تردد حضرت جابر کے فرزندوں کا واقعہ، ہرنی کا قصہ، حضرت بلال کی
کہانی سناتے جاتے۔ وہ پیپلز پارٹی کے جیالوں کی لوٹ کھسوٹ سے بڑے تنگ
تھے۔ ایک دن راہ چلتے چلتے تین جیالے آئے۔ اور کہنے لگے: ''لیا او مولوی! جو کما کر لا
رہا ہے ہمارے حوالے کر۔ تو سرمایہ داروں سے پیسے بٹور لاتا ہے یہ تو ہمارا مال ہے''۔
وہ لٹ گئے مولوی نور محمد دکھی تھے۔ مگر زبان پر کچھ نہ لا سکتے تھے۔ ڈرتے تھے۔ زباں
بندی تھی۔ جیالوں کا ڈر تھا۔ ایک دن وہ مجمع میں پنجابی کے یہ اشعار بڑی میٹھی آواز
سے لاؤڈ سپیکر پر سنا رہے تھے۔

گھگی بیٹھی وچ وظیفے لٹ کھادا گھر کانواں
باز عقاب اڑن جس ویلے پُت نہ ساہمن ماواں

وہ اس کی تشریح یوں کرتے۔ گھگی (فاختہ) سے میری مراد یہ ہے کہ پاکستان
کے پرامن لاکھوں عوام جو دنیاداری کے وظیفے (کاروبار) میں مصروف ہیں۔ آج وہ
آواز نہیں اُٹھاتے۔ دوسری طرف ''پیپلز پارٹی کے جیالوں'' کے کانواں (کوؤں) نے
سارا گھر (ملک) اجاڑ دیا ہے۔ اور لوگ کچھ نہیں کہتے۔ کاں (کوا) کی تشریح کرتے
ہوئے فرماتے۔ سارے کاں (کوے) کافر اور مردار ہیں۔ قرآن نے انہیں کافر قرار دیا
ہے: وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ۔ ''سارے کوے کافر ہیں''۔ سارے جیالے لٹیرے ہیں۔
یاد رکھو! ایک وقت آنے والا ہے کہ باز اور عقاب پاکستان کی فضاؤں میں اڑانیں

بھریں گے۔ تو ان کووں کو مار مکائیں گے۔ تو وہ ایسا وقت ہوگا کہ مائیں اپنے بچوں کو
نہ سنبھال سکیں گی۔ اس فریادی تقریر کو ابھی چند ماہ گزرے تھے کہ ملک میں مارشل لاء
لگ گیا۔ جنرل ضیاء الحق عقاب بن کر بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ ٹی وی پر نظر آنے
لگے۔ اب پیپلز پارٹی کے لیڈر اور جیالے چھپنے لگے۔ بعض ملک چھوڑ کر بھاگنے لگے۔
جیسے قیامت برپا ہو۔ اور میدانِ حشر میں مائیں اپنے بچوں کو نہ سنبھال سکیں۔

ہمیں معلوم نہیں کہ آیا مولوی نور محمد ایمن آبادی کو جنرل ضیاء نے کوئی انعام و
کرام دیا ہے یا نہیں یا جنرل پرویز مشرف کی طرح ہمارے علامہ فہامہ ''طاہر القادری
کی ساری مخلصانہ خدمات'' کو ڈکار گیا۔ مولوی نور محمد ایمن آبادی کی پرسوز تقریریں
اپنی جگہ جو بھاٹی دروازے کے باہر ''زنانہ باغ'' میں ہوتی تھیں۔ مگر ایک وقت تھا۔ جب
لوہاری دروازے سے لے کر بھاٹی دروازے تک ایک کھلا خوبصورت سایہ دار درختوں
کے نیچے باغ تھا۔ اس باغ میں علمائے اہلسنّت ہفت روزہ تقریریں کرتے تھے۔ لاہور
بھر سے اہلِ ذوق نہایت شوق سے علماء کرام کی تقریریں سننے کیلئے جمع ہوتے تھے۔
دفتروں کے ملازمین اہتمام سے آ کر تقریریں سنتے تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ ان جلسوں
میں صاحبزادہ فیض الحسن آلومہاروی کی مترنم تقاریر، مولانا محمد عمر اچھروی کی پنجابی
تقاریر، مولانا محمد بخش مسلم کی خوش آواز تقاریر، مولانا غلام الدین انجن شیڈ کی دلچسپ
تقاریر، مولانا عبدالغفور ہزاروی کی دلنواز تقاریر، مولانا عبدالستار خان نیازی کی گرجدار
تقاریر، پیر امانت علی شاہ کی مثنوی مولانا روم کے اشعار سے معمور تقاریر، مولانا محمد شریف
نوری کی لچھے دار تقاریر، بلا تردد سننے کو ملتی تھیں۔ علماء اہلِ سنت کی تقاریر سے بڑے اچھے
اثرات مرتب ہوئے۔ ان اثرات کو محسوس کرتے ہوئے۔ مولانا مودودی نے اپنے تقاریر کی
مراکز کو چھوڑ کر بھاٹی دروازے کے باہر ''جماعت اسلامی'' کا ایک بڑا زبردست اجتماع
کیا۔ یہ اجتماع نہایت ہی کامیاب اجتماع تھا۔ ملک کے گوشے گوشے سے ''جماعت
اسلامی'' کے کارکن آئے ہوئے تھے۔ مگر حکومت وقت کے کارپردازوں نے اس جلسے کو

الٹنے کے لیے بھرپور انداز میں ہلہ گلا کیا۔ جس سے جلسہ درہم برہم ہوگیا۔ اور جماعت
اسلامی کے ایک عالمِ دین اللہ بخش کو جلسہ عام میں قتل کر دیا گیا۔ یہ جلسہ دہشت گردی
کی نذر ہوگیا۔ اس کے بعد ان جلسوں کی بساط الٹ گئی۔

ع آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کر رہ گیا

ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر آج بھی ہمارے علماء اہلِ سنت، خطیب اور مقرر مل جل
کر اجتماعی طور پر لوگوں کو اپنے خیالات سے آگاہ کرنا چاہیں اور لاہور میں ایک ایسا مرکز
بنائیں۔ جہاں لوگ بلا روک ٹوک جمع ہو کر ہمارے سنی علماء کرام کی تقریریں سن سکیں۔
تو رونق گزشتہ آسکتی ہے مگر اب زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔ خوش بیان علماء
''وعظ فروش'' بن گئے ہیں۔ سیلانی علماء کرام، یورپی ممالک اور امریکہ جا کر ''تبلیغ''
کر رہے ہیں۔ کچھ علماء ''سیاسی پارٹیوں'' میں بٹ گئے ہیں۔ کچھ جماعتوں کے
''لیڈر'' بن گئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں۔ ایک دوسرے کے
مرنے جینے کی خبر نہیں۔ ہائے!

ع اہلِ دل کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے!

حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ (م: ۹۸-۳-۱۲):

حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم نعیمیہ بڑے زبردست عالم دین
اور محنتی دینی راہنما تھے۔ ہم ان کے نیاز مند تھے۔ وہ تحریکِ ختم نبوت کے دوران قید و
بند میں رہے۔ قلعہ لاہور کے عذاب خانوں میں رہے۔ رہا ہو کر آئے تو انہوں نے
چوک دالگراں کی مسجد میں ''جامعہ نعیمیہ'' کی بنیاد رکھی۔ مسند تدریس بچھائی۔ طلبہ کو
دعوت عام دی۔ ساتھ ہی آپ ہر ماہ چوک دالگراں میں ایک جلسہ عام کا اہتمام کرتے
تھے۔ اور ملک کے نامور علماء کرام اور مقررین کو بلا کر لوگوں کو تقاریر سناتے تھے۔ ان
دنوں چوک دالگراں کھلا تھا ہزاروں لوگ بیٹھ کر تقاریر سن سکتے تھے۔ نہ ٹریفک کا شور نہ
تجاوزات کا زور۔ مفتی محمد حسین نعیمی کی خوش انتظامی کا یہ عالم تھا کہ لاہور کے گوشے

گوشے سے اہلِ ذوق علماء کرام کو سننے آتے۔ دار العلوم نعیمیہ کے ایک معاون حاجی نور الدین مرحوم تھے۔ بڑے مخیر، طلبہ اور علماء سے محبت کرنے والے تھے۔ ان کا مسجد دالگراں کے پاس ہی برف خانہ تھا۔ ان کی محبت اور خلوص کے پیشِ نظر مفتی صاحب ہر جلسہ کی کرسی صدارت پر انہی کو بٹھاتے وہ بھی اس منصب پر جچتے۔ ایک رات وہ کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ چیف مقرر تھے۔ رات کا وقت تھا۔ حدِ نگاہ تک مجمع تھا۔ جب تقریر شباب پر آئی۔ تو مولانا ہزاروی نے دیکھا کہ صدر محترم سو رہے ہیں۔ آپ نے کچھ نہ کہا۔ مگر تقریر کے دوران ایک واقعہ سنانے لگے۔ فرمایا میں ہزارے کے پہاڑی علاقوں کا رہنے والا ہوں۔ میرے گاؤں میں ایک چرواہا تھا۔ وادیوں میں اپنی بکریاں چرانے لے جاتا۔ مگر کئی بار بھیڑیے نکلتے اور اس کی کوئی نہ کوئی بکری اٹھا کر لے جاتے۔ اسے بڑی نظر رکھنی پڑتی تھی۔ اس کا ایک بارہ سالہ بیٹا تھا۔ اس کا نام نور الدین تھا۔ مگر لوگ اسے ''نورا نورا'' کہتے تھے۔ اس نے بیٹے کو کہا آج تم بکریاں لے جاؤ مگر خیال رکھنا بھیڑیے نہ آجائیں۔ بچہ بکریاں لے گیا وہ چرنے لگیں۔ مگر بچے کو نیند آگئی وہ سو گیا۔ اس کے باپ نے اسے پہاڑی سے دیکھا کہ چرواہا تو سو رہا ہے زور سے آواز دی۔ ''او نوریا!'' جب یہ آواز لاؤڈ سپیکر پر گونجی تو صدر محترم حاجی نور الدین جاگ اٹھے۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی نے فرمایا حاجی صاحب آپ آرام فرمائیں میں نے تو اپنے گاؤں کے ''نورے'' کو کہا تھا اور مجمع لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔

مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ (م:۵۹-۷-۲۴):

مولانا غلام محمد ترنم رحمۃ اللہ علیہ امرتسر سے ہجرت کر کے لاہور آئے۔ بڑے قادر الکلام مقرر تھے۔ بڑی کڑاکے دار آواز تھی۔ بڑے خوش بیان مگر درویش صفت عالم دین تھے۔ وہ امرتسر میں ''امام ابوحنیفہ کانفرنس'' بڑی شان و شوکت سے مناتے تھے۔ سارا امرتسر اس کانفرنس میں اُمڈ آتا۔ لاہور آئے تو مسجد مائی لاڈو میں خطاب جمعہ شروع کیا

اور گوال منڈی کے چوک میں سالانہ ''امام اعظم کانفرنس'' کا اہتمام کرتے تھے۔ گوالمنڈی میں سارے لوگ امرتسر سے آکر بسے تھے۔ مولانا سے مقدور بھر تعاون کرتے اور بڑا شاندار جلسہ ہوتا۔ مسجد مائی لاڈو سے اٹھ کر سیکرٹریٹ کے اندر جامع مسجد میں جمعہ پڑھانے لگے۔ آپ کی توجہ سے مسجد از سر نو مرمت ہوئی اور کشادہ ہوئی۔

آپ کو کئی شہروں سے دعوتِ خطاب آتی۔ شاہدرہ ٹاؤن والوں نے آپ کو دعوتِ خطاب دی۔ آپ نے رات کو بھرپور جلسے سے خطاب کیا۔ رات کے ایک بجے آپ فارغ ہوئے مگر کسی نے آپ کو سواری مہیا کی نہ کوئی نذرانہ۔ سارے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ آپ اندھیری رات میں اکیلے رہ گئے۔ جیب میں روپیہ تھا نہ پائی۔ ان دنوں شاہدرہ اور لاہور کے درمیان تانگے چلتے تھے۔ وہ بھی آدھی رات کے بعد بند ہو جاتے تھے۔ آپ تنہا اندھیرے میں پیدل چلتے چلتے لاہور روانہ ہوئے۔ آپ جوتے کی بجائے ''ہوائی چپل'' پہنا کرتے تھے۔ دریائے راوی کے پل پر پہنچے تو چپل کا ایک تسمہ ٹوٹ گیا۔ ایک چپل ہاتھ میں پکڑ لی اور سفر جاری رکھا۔ چلتے چلتے شاہی مسجد کے قریب پہنچے، تو ایک تانگہ رکا۔ اس میں ایک عیسائی پادری بیٹھا تھا وہ مولانا کو جانتا تھا۔ آپ کو پہچان کر تانگے میں بٹھایا اور حیرت سے پوچھا مولانا آپ اس وقت کہاں؟ آپ نے بتایا کہ شاہدرہ ٹاؤن میں ایک جلسہ تھا وہاں سے آرہا ہوں۔ اس نے کہا: پیدل؟ فرمانے لگے: ''اسلام کے مبلغ پیدل ہی تبلیغ کرتے ہیں۔ ہاں عیسائی پادری چوتھے آسمان کی بلندیوں پر اڑتے رہتے ہیں''۔ پادری نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا ''ویل مسٹر ترنم'' مولانا نے اس پادری کے سامنے شاہدرہ کے مسلمانوں کی ''بے نیازی'' کی کوئی شکایت نہ کی۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (م:۱۳۷۸ھ):

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ایک احراری مقرر تھے۔ گرج دار آواز، شعلہ بیانی اور ملکی سیاست پر بات کرنے کا ملکہ تھا۔ وہ ہندوؤں کے وظیفہ خوار تھے۔ اور نظریہ

پاکستان کی مخالفت کرتے تھے۔اس وجہ سے انہیں ''بوکا'' کہا جاتا تھا۔دہلی دروا[illegible] لاہور کے باغ میں مجلس احرارِ اسلام کا ایک جلسہ تھا۔یہ بات پاکستان بننے سے [illegible] ہے۔تقریر عروج پر تھی مولانا حبیب الرحمٰن گرج رہے تھے۔ایک شخص مجمع میں [illegible] چلا کر کہنے لگا۔پہلے مجلس احرار تین لاکھ چندے کا حساب دے۔مولانا لدھیانوی [illegible] گئے۔فرمایا ''ہم احرار ہیں''.....آزاد لوگ ہیں۔چندہ لیں گے۔حساب نہیں دیں گے'' آپ نے میز پر زوردار مکا مارا۔سٹیج سے نعرہ تکبیر بلند ہوا۔پھر بولے ہم مسلمان [illegible] حضرت علی کے ماننے والے فقیر ہیں ہم ہندو بنیئے نہیں کہ کوڑی کوڑی کا حساب [illegible] پھریں۔اسٹیج سے پھر نعرہ تکبیر بلند ہوا۔مولانا پھر گرج کر بولے: ہاں! ہاں! ''اگر تم لوگوں نے مجلس احرار سے چندے کا حساب لینا ہے تو پہلے انگریز حکومت سے عالمی جنگ کے اخراجات کا حساب لو۔پھر مجلسِ احرار سے بات کرنا''۔اس بات پر نعرہ ہائے تکبیر بلند ہوئے۔اور سوال کرنے والا غائب تھا۔

مولانا محمد یٰسین:

مولانا محمد یٰسین راسخ العقیدہ سنی عالم دین تھے۔عمر ستر سال سے زیادہ تھی۔بڑے جذباتی بڑے کھرے،ان کے ہاتھ میں ہروقت ایک چھڑی رہتی تھی وہ مسلم مسجد لاہور کے نیچے مولوی شمس الدین مرحوم کی کتابوں کی دکان میں تشریف لاتے۔جہاں بہت سے علماء اور کتاب دوست حضرات بھی آبیٹھتے تھے۔مولانا طبیعت کے بہت سخت تھے اور بے پناہ جذباتی ان کے سامنے کوئی بات نہیں کرسکتا تھا۔اگر کوئی بات خلاف طبیعت کرنے کی جرأت کرتا تو وہ خشمناک نظروں سے اسے ایسے دیکھتے کہ وہ ڈر کر بیٹھ جاتا۔ہم نے ان کا نام ''مولوی **کچیچی**'' رکھا ہوا تھا انہیں اپنا نام معلوم ہوگیا تھا مگر وہ ہماری اجتماعی قوت کے سامنے ہمیں کچھ نہ کہتے۔

آج کی طرح ان دنوں بھی لاہور میں دیوبندیوں اور وہابیوں کا زور بڑھتا جارہا تھا۔ایک شخص نے ڈرتے ڈرتے ''مولوی **کچیچی**'' کو کہا۔مولوی صاحب آج کل

[illegible]یوں کا زور ہو رہا ہے۔فرمایا کہاں؟ مجھے بتاؤ! کہا چینیاں والی مسجد میں آج کل سارے [illegible] جمع ہوتے ہیں۔پوچھا کہاں ہے چینیاں والی مسجد؟ اس نے مولوی کی چھڑی کا رخ [illegible]یاں والی مسجد کی طرف کردیا۔مولوی **کچیچی** نے غصے میں آگ بگولہ ہوکر کہا دھڑام! [illegible]ڑام! لو لاہور کے سارے وہابی ختم ہوگئے!

ہم خوش ہوگئے۔چلو مولوی **کچیچی** نے لاہور کے وہابی ختم کردیئے۔آج ہم [illegible] فرقوں کو لاہور میں دوڑ دھوپ کرتے دیکھتے ہیں۔اور اپنے مقرروں کی رات کو گرجدار [illegible]تقریروں کی آوازیں سنتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے۔سارے وہابی، دیوبندی تبلیغی جماعت [illegible]الے ''دھڑام'' ہوگئے ہیں۔مگر دوسرے دن یہ سارے حشرات الارض کی طرح دوڑتے [illegible]ظر آتے ہیں۔ہمارے مدرسے ویراں ہو رہے ہیں۔ہماری مسجدوں پر دیوبندی قبضہ کر [illegible]ہے ہیں۔ہماری خانقاہوں پر شیعوں کے کالے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔

ع گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا؟

شورش کاشمیری (م:۲۵-۱۰-۷۵):

شورش کاشمیری زبردست مقرر، قلم کار اور ملی مسائل کو زوردار انداز میں بیان کرتے تھے۔ان کی زبان اور قلم یکساں چلتی تھی۔اور خوب چلتی تھی۔ہم لوگ ان کی چھے دار تقریریں سنتے اور ان کے ہفت روزہ چٹان'' سے ''قلم قتلے'' کے کالم و چٹخارے لے کر پڑھتے تھے۔اگرچہ وہ احراری تھے۔احراریوں کے ترجمان تھے۔اور ہمارے مسلک کے سخت خلاف تھے۔مگر ان سے جب ملاقات ہوتی تو خندہ پیشانی سے ملتے۔لطیف گفتگو کرتے اور بعض اوقات عمدہ شعر سنا کر ہمیں خوش کردیتے۔وہ اکثر مسلم مسجد لاہور میں نماز جمعہ پڑھتے تھے۔ایک دن نماز پڑھ کر نکلے۔مجھے اور بشیر حسین ناظم کو دیکھ کر اپنے پاس بلایا۔اور فرمانے لگے اگر تم نے ''اسلاف کی نشانی'' دیکھنی ہو تو مولانا عبداللہ درخواستی آئے ہوئے ہیں۔ان کی زیارت کرو۔ہم نے شورش کو ساتھ لیا اور مسلم مسجد کے نیچے ادویات کی ایک دکان کے تہ خانے میں چلے گئے۔وہاں مولانا عبداللہ درخواستی

ایک قالین پر چند عقید تمندوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ میں اور شورش تو کھڑے رہے
مگر بشیر حسین ناظم آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً مولانا عبداللہ درخواستی کے قدموں میں سر رکھ کر
''سجدہ کناں'' بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ مولانا درخواستی اس کے سر پر
ہاتھ پھیرتے جاتے جیسے پالتو بلی کے سر پر ہاتھ پھیرا جاتا ہے۔ میں اور شورش کاشمیری
کھڑے کھڑے، بشیر حسین ناظم کی ''حالتِ زار'' کو دیکھتے رہے۔ نہ مولانا درخواستی نے
اسے اٹھایا نہ کسی مولوی نے اسے سمجھایا کہ ''سجدہ نہ کرو'' ناظم خود ہی اٹھا۔ آنسو بہاتا
رہا۔ اور اہلِ مجلس پر اپنا رنگ جماتا رہا۔ مولانا درخواستی نے ہم سب کو دو دو مالٹے دیے
اور کہا کہ یہ ''تبرک'' ہے۔ لے لو پھر ایک ایک تعویذ دیا۔ اور فرمایا یہ تعویذ حضرت امام
شافعی کا مجرب تعویذ ہے۔ ہم چند لمحے مجلس میں رہے۔ اجازت لے کر باہر آ گئے۔
باہر سڑک پر آ کر بشیر حسین ناظم نے کہا شورش! آپ کے ''اسلاف'' ایسے تھے۔ نہ سجدہ
کرنے سے روکتے تھے۔ تبرک دیتے تھے۔ تعویذ بانٹتے تھے شورش کاشمیری نے ناظم کو
کہا دفعہ ہو جاؤ۔ ہمارے بزرگوں کے خلاف بکواس نہ کرو۔

تمہاری زلف میں پہنچی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو میرے نامۂ سیاہ میں ہے

(''جہانِ رضا'' جون، جولائی ۲۰۰۳ء)

علماء کرام کی لطیف یادیں

مولانا کوثر نیازی (م: ۹۴-۳-۱۹):

مولانا کوثر نیازی کی یاد آئی۔ وہ عالمِ دین، معلم علوم دینیہ اور فاضلِ درس نظامی تو
نہیں تھے۔ مگر دانشور تھے، صحافی تھے، صاحبِ قلم تھے، خطیب تھے، ادیب تھے پھر
سیاسی میدانوں کے شاہسوار تھے۔ وہ وزیر بنے مشیر بنے۔ زندگی کے آخری سالوں
میں امام احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کے علم و فضل کے ترجمان بن کر برِ صغیر پاک و ہند میں
''نغماتِ رضا'' کی ''صدائے دلستان'' بن گئے۔

ہم ان کے حلقۂ احباب میں اس وقت داخل ہوئے جب ان کا نام ''حیات محمد
خاں'' تھا۔ اور میانوالی کی خشک وادی سے نکل کر لاہور آئے تو ''کوثر نیازی'' بن
گئے۔ لاہور کی علمی زندگی میں داخل ہوئے۔ ہم ان دنوں کی بات کر رہے ہیں جب وہ
شام نگر چوبرجی کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ اور شاہ عالمی بازار کی لال
مسجد میں نمازِ جمعہ سے پہلے ''ماڈرن خطاب'' کیا کرتے تھے۔ بشیر حسین ناظم، مولانا
محمد بخش مسلم مرحوم اور قاری محمد عطاء اللہ کے ساتھ ہم کبھی کبھی ان کے حجرے میں چلے
جاتے۔ ہم نے ان کو ''مقطوع اللحیہ'' تو نہیں دیکھا البتہ وہ ''مقصور اللحیہ'' تھے۔ ان
دنوں ہم خود بھی ''مقصور اللحیہ'' تھے۔ بشیر حسین ناظم ''مفقود اللحیہ'' تھے۔ ہم سب
سرکاری ملازم تھے۔ مولانا مسلم محکمہ امداد باہمی، بشیر حسین ناظم آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ اور
ہم محکمہ صنعت میں انسپکٹر تھے۔ ہم سب مل کر مولانا کوثر نیازی کے پاس جاتے اور ان
کے حجرے میں چائے کا دور چلتا۔

مولانا کوثر نیازی ان دنوں جماعت اسلامی کی ''بلبل ہزار داستان'' تھے۔ مولانا

مودودی کی مجالس کے ''امیر خسرو'' تھے۔ اور بقول شورش کاشمیری میخانہ جماعت اسلامی کے ''مغبچہ'' تھے۔ جماعت اسلامی سے دوری کے باوجود ہم لوگ مولانا کوثر نیازی کو پسند کرتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب امریکہ کی ایک یہودی خاتون ''مریم'' دامن اسلام میں آکر مولانا مودودی کے گھر ذیلدار پارک اچھرہ میں قیام پذیر تھی۔ اور دینی تربیت پا رہی تھی۔ مولانا کوثر نیازی اس جواں سال خاتون سے بڑے متاثر تھے۔ وہ ہر روز دیسی مرغی کے پانچ انڈے ابالتے اور سائیکل پر سوار ہو کر شام نگر سے اچھرے جاتے۔ اور نومسلم خاتون کو پیش کرتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ مولانا ہمیں تو خالی چائے کی پیالی پلاتے ہیں اور مریم کو دیسی مرغی کے ابلے ہوئے انڈے کھلاتے ہیں۔ اگرچہ ان کا یہ فعل برا نہیں تھا۔ مگر ہمیں ''احساس محرومی'' اندر سے کاٹتا تھا۔ بشیر حسین ناظم نے ایک دن مولانا مسلم کو مولانا کوثر نیازی کی اس ''حرکت'' سے آگاہ کیا۔ ہم نے بھی ''اپنے احساس محرومی'' کا رونا رویا۔ دوسرے دن محفل جمی تو مولانا مسلم فرمانے لگے۔ ''او کوثریا''؟ تیری یہ حرکت کہ مریم کے لیے پانچ پانچ انڈے اور ہمیں خالی چائے''؟ مولانا کوثر نیازی فرمانے لگے حضرت وہ نومسلم ہے میں تو یہ خدمت ''تالیف القلوب'' کے لیے کرتا ہوں۔ مسلم صاحب فرمانے لگے وہ تو کل کی مسلمان ہے اور ہم تو صدیوں سے مسلمان چلے آرہے ہیں؟ مجلس کشت زعفران بن گئی۔ ہم سب نے مسلم صاحب کے ''جواب کو باصواب'' قرار دیا۔ اس کے بعد مولانا کوثر نیازی نے زندگی بھر ہمیں کبھی خالی چائے نہیں پلائی۔

غالباً ۱۹۳۹ء کی بات ہے۔ ہم ابھی دس بارہ سال کے طالب علم تھے۔ مسجد وزیر خاں میں انجمن حزب الاحناف کا سالانہ جلسہ ہوتا تھا۔ جلسہ تین دن رہتا۔ اس جلسے کا انتظام واہتمام علامہ سید ابو البرکات، سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کیا کرتے تھے۔ بریلی شریف، مراد آباد، پیلی بھیت، بمبئی، اور آگرہ سے علماء اہل سنت کے قافلے آتے اور علامہ ابو البرکات ان کے استقبال کے لیے علماء لاہور کا ایک وفد سجا کر ریلوے اسٹیشن پر حاضر

ہوتے۔ علماء کرام کے یہ قافلے جب ریلوے اسٹیشن سے چلتے تو نولکھا بازار، لنڈا بازار، اور دہلی دروازے کے دکاندار دکانوں سے باہر نکل کر نعرۂ تکبیر اور نعرۂ رسالت بلند کرتے۔

وزیر خاں کی مسجد میں جلسہ گاہ بڑی شان سے سجائی جاتی۔ سامعین وحاضرین کے لیے آرام دہ فرش بچھائے جاتے۔ سٹیج پر ساٹھ ستر علماء کرام کی نشستیں لگتیں۔ یہ محدث کچھوچھوی تشریف فرما ہیں، یہ صدر الافاضل جلوہ فرما ہیں، یہ صدر الشریعہ جلوہ آرا ہیں، یہ شہزادۂ اعلیٰ حضرت مولانا حامد رضا خاں ہیں، یہ شیر بیشہ اہلسنت مولانا حشمت علی ہیں۔ یہ وصی احمد سورتی کے بیٹے بیٹھے ہیں۔ یہ محدث لائلپوری مولانا سردار احمد بریلی سے آئے ہیں۔ یہ اشرفی میاں ہیں، یہ کچھوچھے سے تشریف لائے ہیں، یہ گڑھی اختیار خاں سے محمد یار فریدی ہیں۔ یہ جھنگ سے مولانا قطب الدین جھنگوی ہیں، یہ گجرات سے پیر ولایت شاہ ہیں۔ کس کس کا نام لیں اور کن کن کا ذکر کریں۔

ع اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر!

یہ آسمان سنیت کے آفتاب وماہتاب تھے جو وزیر خاں کی مسجد میں عقائد اہلسنت کے مختلف موضوعات پر تقاریر کرتے تھے۔ ادھر سامعین تھے۔ جو پنجاب کے مختلف شہروں سے کھچے چلے آتے۔ مسجد وزیر خاں کا صحن کھچا کھچ بھرا ہوتا۔ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کے مختلف علاقوں سے لوگ جوق در جوق آتے۔

اگرچہ ہم طالب علم تھے۔ لیکن ہماری دلی خواہش ہوتی کی علماء کرام کی قربت ہمیں نصیب ہو۔ ان کے پہلو میں بیٹھیں۔ ایک تو اسٹیج پر کھڑے ہو کر جلسہ گاہ کا نظارہ کریں گے دوسرے ان بلند پایہ علماء کے دامن کے سائے میں جگہ مل جائے گی۔ مگر ہمیں کون سٹیج پر جانے دیتا...... کون پوچھے ہے تیری بات رضا!...... نئے کپڑے پہن کر پانی کا جگ اٹھائے اسٹیج پر جا پہنچتے۔ جہاں ساٹھ علماء کرام جلوہ فرما ہیں۔ کسی کے سامنے پانی کا گلاس پیش کیا۔ کسی کے سامنے پاندان رکھا۔ کسی کے سامنے اگال دان رکھا۔ کسی کا رومال گر پڑتا تو اٹھا کر پکڑاتے۔ کسی کے پاؤں پر پھولوں کی پتیاں گری ہوئی نظر آتیں تو

انہیں اٹھائے۔ سی کا رقعہ سٹیج سیکرٹری تک پہنچاتے ہماری یہ غلامانہ ادائیں دیکھ کر ہمیں ان سے کوئی نہ ہٹا تا حتی کہ جب غیر حاضر ہوتے تو علامہ ابوالبرکات آواز دے کر بلا لیتے!

ؔ تیرے کوچے اس بہانے میرا دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا!

ہم کس کس کی تقریر کا ذکر کریں، کس کس کے بیان کا تذکرہ کریں، کس کس کی شعلہ نوائی کا ذکر کریں۔ کن کن نکات کو سامنے لائیں۔ ہر ایک مقرر آفتاب و ماہتاب کی کرنیں بکھیرتا دکھائی دیتا تھا۔ جب سید پیر ولایت شاہ گجراتی تقریر کیلئے آتے۔ تو میز سے گلدستے ہٹا دیئے جاتے۔ دوسری چیزوں کو اٹھا دیا جاتا۔ ان کی تقریر بڑی پر جوش ہوتی وہ گرجتے اور چمکتے ہوئے مجمعے پر چھا جاتے۔

ایک دن وہ سامعین کے سامنے اسلام کی عظمت پر تقریر کر رہے تھے۔ اور ایک ہندو عورت کے اسلام لانے کا واقعہ سنا رہے تھے۔ جو حضور پرنور پر ہزاروں بار درود شریف پڑھ کر پہلے زیارت سے مشرف ہوئی۔ پھر اسلام کے دامن میں آ گئی۔ اس مقام پر آ کر شاہ صاحب حضور نبی کریم کی شان پر اظہار خیال فرماتے ہوئے۔ درود شریف کے منکرین پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ اور منکرین شان رسالت کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ''او...... ! تہاڈے کولوں تے کھترانی چنگی نکلی'' شاہ صاحب کے اس جملے پر سارا مجمع لوٹ پوٹ ہو گیا۔ ہندوستان سے آئے ہوئے علماء کرام پنجابی سے ناآشنا تھے خود علامہ ابوالبرکات پنجابی زبان کی ٹکسالی اصطلاح سے ناواقف تھے۔ ان حضرات میں سے کسی کو سمجھ نہ آئی۔ علامہ ابوالبرکات نے ایک شخص سے پوچھا شاہ صاحب نے کیا فرمایا کہ سارا مجمع لوٹ پوٹ ہو رہا ہے۔ اس شخص نے عرض کی کہ حضور شاہ صاحب نے تصوف کا ایک ''باریک نکتہ'' بیان فرمایا ہے۔ علامہ ابوالبرکات خوش ہو کر فرمانے لگے۔ ''کیوں نہ ہوں آخر سادات کے گھرانے کے عالم دین ہیں!''

ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں (سیالکوٹ):

ابوالنور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں (سیالکوٹ) بڑے نامور خطیب، صاحب قلم

اور شعر و سخن کے مالک ہیں۔ ان کی عمر غالباً نوے سال سے کچھ زیادہ ہے۔ حضرت شیخ الحدیث محمد شریف کوٹلی لوہاراں کے فرزند ارجمند ہیں۔ دار العلوم حزب الاحناف کے فارغ التحصیل ہیں۔ وہ صاحب علم و قلم ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مولانا بشیر کا میدان خطابت میں طوطی بولتا تھا۔ ہر شہر اور ہر قریہ کے لوگ انہیں بلاتے وہ جہاں جاتے مجمع پر چھا جاتے۔ خوش آواز تھے قادر الکلام خطیب تھے ان کا طرز بیان مخصوص تھا۔ دوران تقریر لطائف بیان کرتے۔ اور مجمع کو کشت زعفران بنا دیتے۔ اشعار کا برمحل استعمال کرتے تو اہل ذوق جھوم جھوم جاتے۔ وہ خود شاعر ہیں ''حاجی لق لق'' کے مقابلے میں ''حاجی حق حق'' کا تخلص رکھتے ہیں۔ شعر کہتے تھے اور خوب کہتے تھے۔ انھوں نے جوانی میں ماہنامہ ''ماہ طیبہ'' نکالا۔ جو سُنّی صحافت کا بہترین ترجمان تھا۔ ان دنوں بڑھاپے نے انہیں گوشہ نشین بنا دیا ہے ورنہ وہ اپنے وقت میں زبان و قلم کے ماہر تھے۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن سے علماء اہلسنّت کو بڑی راہنمائی ملتی ہے۔

ان کے ضلع سیالکوٹ کے بہت سے لوگ ریاست بہاولپور میں زمینیں آباد کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ انہوں نے مختلف علاقوں میں مربعے آباد کیے۔ یہ پاکستان سے پہلے کا واقعہ ہے ان سیالکوٹی عقیدتمندوں نے آپ کو ایک جلسے میں بلایا ہارون آباد کے مضافات میں ایک گاؤں میں جلسہ ہوا۔ دور دور سے صحرانورد اونٹوں پر سوار ہو کر آئے۔ مولانا محمد بشیر صاحب تقریر کر رہے ہیں۔ مجمع پر سناٹا طاری ہے۔ حد نگاہ تک لوگوں کا اجتماع ہے ہر ایک کی نگاہ آپ کے چہرے پر لگی ہوئی ہے۔ اور کان آپ کی آواز پر لگے ہیں۔ تقریر جوبن پر آئی تو مولانا بشیر فوراً رک گئے۔ فرمانے لگے میں اپنے سامعین کو رات کا ایک ''حادثہ'' سنانا چاہتا ہوں۔ لوگ گوش برآواز تھے کہ رات کو کیا حادثہ ہو گیا۔ میزبان دم بخود ہے خدا جانے مولانا بشیر صاحب کو کیا حادثہ درپیش آیا۔ مولانا بشیر صاحب بولے۔ میں رات کو سویا ہوا تھا۔ کمرے میں اکیلا ہی تھا۔ آدھی رات کے وقت مجھے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ آہیں، سسکیاں اور چیخیں سنائی دیں۔ میر

اٹھا ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، کوئی بھی نہیں تھا۔ لالٹین جلائی۔ کوئی چیز نظر نہ آئی۔ میں نے خیال کیا۔ اس گھر میں جنات کا بسیرا ہے۔ میں نے ''اصحاب کہف کا وظیفہ'' پڑھا۔ مگر رونا دھونا اور چیخ و پکار بند نہ ہوئی۔ آخر میں نے حضور پر درود پڑھنا شروع کیا مگر آوازیں مسلسل آتی رہیں۔ میں نے غور کیا تو جس بستر پہ سویا ہوا تھا۔ اس کی رضائی، تلائی، اور چادر یں رو رہی ہیں۔ تکیہ رو رہا ہے۔ کمبل رو رہا ہے۔ کپڑے آہ وزاری کر رہے ہیں۔ یہ ساری چیزیں ریشمی کمخاب اور اعلیٰ سوتی کپڑے کی بنی ہوئی تھیں۔ اور بالکل نئی نکور تھیں۔ میں نے پوچھا تم کیوں رو رہی ہو؟ وہ کہنے لگیں ''مولوی صاحب! ان لوگوں نے پہلی بار ہمیں آپ کے استعمال میں دیا ہے۔ آپ عالم دین ہیں۔ اللہ والے ہیں رسول اللہ کے عاشق ہیں۔ آپ سوئے ہمیں بڑا سکون ملا آپ کے جانے کے بعد یہ لوگ خدا معلوم کن جاہلوں اجڈوں اور جانگلیوں کے حوالے کریں گے۔ جو اپنے ناپاک گھٹنوں سے ہمیں کھدیڑ دیں گے۔ ہم تو اس خوف سے رو رہے ہیں کہ کل کیا ہوگا''؟

واقعہ بڑا پر لطف تھا لوگ بڑے محظوظ ہو رہے تھے میزبان مجمعے سے اٹھا۔ اور کہنے لگا ''مولوی بشیر صاحب یہ سارا بستر آپ کا ہوا!''

(''جہانِ رضا'' دسمبر ۲۰۰۳ء)

علامہ شاہ احمد نورانی کے غیر سیاسی شب و روز

مولانا شاہ احمد نورانی جمعیت العلماء پاکستان کے صدر، ورلڈ اسلامک مشن کے چیئرمین اور ملی یکجہتی کونسل کے صدر نشین ہیں۔ ان کی زندگی کا زیادہ حصہ سیاسی خارزاروں میں سفر کرتے گزرا ہے۔ وہ پاکستان کی مختلف سیاسی تحریکوں میں ایک مقتدر راہنما کی حیثیت سے نمایاں رہے ہیں۔ قید و بند کی صعوبتوں کو لبیک کہتے رہے۔ نیشنل اسمبلیوں اور سینٹ میں ان کے سیاسی کردار کو بڑی پذیرائی ملی۔ وہ اقتداری قوتوں کو للکارتے بھی رہے اور ان قوتوں کے مظالم کے سامنے سینہ سپر بھی رہے۔ انہیں اپنے سیاسی حریفوں اور حلیفوں سے واسطہ بھی رہا مگر ان کے قدم استقلال کو کبھی لغزش نہیں آئی۔

سیاسی زندگی کے برعکس مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک غیر سیاسی زندگی ہے جس پر ہم جیسے غیر سیاسی لوگ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ مولانا ۱۹۲۸ء میں میرٹھ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی مبلغ اسلام مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی اپنے وقت کے بڑے بلند پایہ عالم دین تھے۔ وہ فاضل بریلوی کے فاضل تلامذہ میں شامل ہوتے ہیں۔ مولانا عبدالعلیم مرحوم کو اردو، انگریزی، فارسی اور عربی زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فاضل بریلوی نے آپ کو ہندوستان کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں میں اسلامی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے منتخب کیا۔ چنانچہ آپ نے ساری زندگی یورپ، امریکہ، افریقی ممالک اور انڈونیشیا، فلپائن اور مشرق بعید کے کئی ممالک میں تبلیغ کی۔ انہوں نے امریکہ میں کئی اسلامی سنٹر قائم کیے۔ افریقی ممالک میں اسلام کی حقانیت کو پھیلایا، جنوبی افریقہ میں اسلامی مراکز قائم کیے۔ امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ، فلپائن اور تھائی لینڈ میں اسلامی تبلیغ کے لیے کئی سفر کیے۔ آپ نے دنیا

کے ان خطوں کی زبانوں پر بھی عبور حاصل کیا اور وہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کو اسلام کی حقانیت سے روشناس کیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی اپنے والد مکرم کے ساتھ دنیا بھر کے مختلف ممالک میں جاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مولانا نورانی کو عربی، انگریزی، ڈچ، جرمنی، فرانسیسی اور افریقہ کی علاقائی زبانوں پر بڑا عبور ہے۔

وہ عراق، لیبیا، برطانیہ، ہالینڈ، فرانس، امریکہ جنوبی افریقہ اور فلپائنی زبانوں میں یکساں طور پر بڑی روانی سے خطاب کرتے ہیں۔ وہ امریکہ کی یونیورسٹیوں میں انگریزی میں لیکچرز دیتے ہیں۔ وہ عراق اور لیبیا کے اعلیٰ اجلاس میں عربی زبان میں خطاب کرتے ہیں۔ وہ ہالینڈ میں اور فرانس کے علمی مراکز میں کھل کر بات کرتے ہیں۔ آج پاکستان کا شاید ہی کوئی ایسا لیڈر ہو جو ترجمان کے بغیر ان ممالک میں براہ راست لوگوں کو مخاطب کر سکتا ہو۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے میرٹھ کی عظیم الشان دینی درسگاہوں سے مختلف علوم کی تربیت حاصل کی۔ تفاسیر و احادیث میں سند فضیلت لے کر پاکستان آئے۔ آپ نے پاکستان میں علماء دین اور مشائخ وقت کے ساتھ علمی اور روحانی رابطے پیدا کیے اور اپنے والد کے زیر تربیت رہ کر جن علمی مقامات اور روحانی احوال کا مطالعہ کیا تھا، اس میں اہل علم وفضل اور مشائخ کرام کی مجالس میں پہنچ کر اضافہ کیا۔ آپ کی ابتدائی زندگی ایک ابھرتے ہوئے عالم دین اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے سامنے آئی۔ آپ کے والد عمر کے آخری حصے میں اپنے ذاتی مکان مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہوئے۔ مولانا شاہ احمد نورانی بھی اپنے والد گرامی کے زیر سایہ ایک عرصہ تک مدینہ پاک میں رہے۔ آپ کی شادی قطب مدینہ حضرت مولانا ضیاء الدین مدنی کے بیٹے فضیلت الشیخ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدنی مدظلہ کی بیٹی (جو مدینہ یونیورسٹی کی فاضلہ اور جدہ یونیورسٹی کی ڈاکٹر ہیں) سے ہوئی۔ آپ کے والد مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھی مدینہ

منورہ میں ہی واصل بحق ہوئے اور ''جنت البقیع'' میں راحت وسکون پایا۔

مولانا شاہ احمد نورانی مدینہ منورہ سے پاکستان آئے تو کراچی صدر میں ایک کرائے کا فلیٹ لیا۔ الحمدللہ پاکستان نے ہزاروں رنگ بدلے مگر شاہ احمد نورانی چالیس سال سے اسی فلیٹ میں کرایہ دار کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ آج بھی رہ رہے ہیں۔ صبر وقناعت کی یہ مثال شاید ہی پاکستان کے کسی دینی یا سیاسی راہنما میں ملے۔

سابقہ تیس سال سے آپ کا معمول رہا ہے کہ صدر میں ایک مسجد میں ہر سال تراویح میں پورا قرآن سناتے ہیں۔ شبینہ کی طاق راتوں میں اضافی قرآن پڑھتے ہیں۔ آپ نے اپنے معمول میں کبھی نہ ناغہ کیا ہے نہ کوتاہی کی ہے۔ آپ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ سرکار مدینہ کی زبان عربی میں بات کرتے ہیں مگر پاکستانی ملاقاتیوں کے ساتھ دہلوی اردو میں گفتگو کرتے ہیں۔ سیاست میں آنے سے پہلے آپ مختلف وظائف کی ادائیگی میں ساری ساری رات گزار دیتے تھے۔ دعائے ''حزب البحر'' اور ''قصیدہ بُردہ'' سیاسی مصروفیتوں کے باوجود آج بھی آپ کے معمولات میں شامل ہے۔

حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی صدر جمعیت علماء پاکستان کی رحلت کے بعد آپ کو جمعیت کا صدر چنا گیا۔ اس وقت تک جمعیت علماء پاکستان سنیوں کی ایک دینی اور تبلیغی جماعت تھی نہ الیکشن میں حصہ لیتی نہ انتخابی مہموں میں۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے علماء اہل سنت کا ایک قافلہ تیار کیا اور کراچی سے چترال تک اور کھوکھراپار سے خیبر تک علماء ومشائخ میں دینی بیداری اور اعتقادی یکجہتی کے لیے کام کیا اور شہر بہ شہر قریہ بہ قریہ پہنچ کر علماء کرام کو حجروں، مدرسوں، خانقاہوں اور مسجدوں کو دینی اور روحانی مراکز بنانے کے لیے تیار کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا نورانی کی اس مہم میں ملک بھر کے سنی علماء ومشائخ نے آپ کی آواز پر لبیک کہا اور جو علماء صرف نماز، نکاح، جنازہ اور ختم درود تک محدود تھے، وہ علمی جرأت لے کر متحد ہو گئے۔ جو صاحبزادگان اور سجادہ نشین تعویذات، نذرانے اور روحانی مجالس تک محدود تھے، وہ تبلیغ دین پر آمادہ ہو گئے۔

مولانا نورانی ایک شب بیدار عالم دین ہیں۔ وہ سیاست کے طویل سفر میں رات کے آخری لمحوں تک ملک کے مختلف علاقوں میں سیاسی اور دینی جلسوں میں خطاب کرتے ہیں مگر مجال ہے کہ وہ نماز تہجد تک قضا کریں۔ ان کے معمولات روحانی میں "دعائے حزب البحر" اور قصیدہ بردہ" آج بھی اسی طرح تازہ ہے جس طرح آج سے چالیس سال پہلے اپنے والد کے زیر سایہ تازہ تھے۔ وہ زمین کے فرش پر سوتے، مساکین کے ساتھ بیٹھنے اور غرباء کی محفل میں وقت گزارنے سے نہیں اکتاتے۔

جنرل ضیاء الحق کے زمانۂ اقتدار میں میر علی احمد خان تالپور مرحوم وزیر دفاع تھے۔ وہ میر بھی تھے، امیر بھی تھے اور وزیر بھی تھے، مگر ایک دانشور ہونے کی وجہ سے شاہ احمد نورانی کے علم و فضل کی قدر کرتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ جنرل ضیاء الحق کی مخالفت کی وجہ سے شاہ احمد نورانی سے کبیدہ خاطر تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے ایک دن اپنی ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق نے اکثر مولویوں کو دانہ ڈال کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے مگر یہ مولوی نورانی قابو نہیں آیا۔ جنرل ضیاء نے مولانا کو رام کرنے کے لیے مجھے اشارہ کیا مگر مولانا نورانی نہ میرے قابو آئے نہ ضیاء کی انٹیلی جنس انہیں رام کر سکی۔ آخر کار جنرل ضیاء نے فیصلہ کیا کہ ایئر مارشل اصغر خان کی طرح مولانا نورانی کو ان کے گھر میں نظر بند کر دیا جائے۔ میں نے جنرل ضیاء الحق کو بتایا اس مولوی کو چھوڑ دیں یہ عام لوگوں میں قرآن پڑھتا ہے تو لوگوں کے دل ڈھل جاتے ہیں۔ جب "قصیدہ بردہ" پڑھتا ہے تو میں دست بستہ کھڑا ہو جاتا ہوں مگر سنا ہے کہ وہ رات کو "حزب البحر" پڑھتا ہے۔ اس وظیفے کی مار سات سمندروں کی تہوں میں بھی اپنے مخالف کو نشانہ بناتی ہے۔ یہ سن کر جنرل مرحوم نے مولانا کی نظر بندی کا خیال چھوڑ دیا۔

مولانا کا لباس اسلامی لباس کا نمونہ ہے۔ فقیرانہ لباس ہے، سر پر خس کی بنی ٹوپی پر گہرا عنابی عمامہ، گلے میں رنگین پٹکا اور ہاتھ میں عصائے عالمانہ۔ وہ جب نورانی لباس میں نورانی آن بان سے نکلتے ہیں تو ایک درویش مسلمان کی شبیہ سامنے آجاتی

ہے۔ انہوں نے کبھی دولت کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں نہیں مارے۔ وہ وزارتی زندگی کے دور میں بھی فقیری کی مثال رہے۔ وہ اسمبلیوں میں رہ کر بھی تہی دست ہیں۔ سیاسی لیڈروں کی دولت مندی کو تو چھوڑیئے، آج اس کے بینک میں زکواتی مولویوں اور سرکاری سجادہ نشینوں سے بھی کم بینک بیلنس نکلے گا۔ آج جو علماء اپنے آقایان ولی نعمت کو خوش کرنے کے لیے مولانا شاہ احمد نورانی کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کی تجوریاں دیکھ کر سر ندامت سے جھک جاتے ہیں۔

سیاسی ہماہمی کے باوجود مولانا نورانی ملک اور بیرون ملک کی دینی درسگاہوں کی سرپرستی سے غافل نہیں رہتے اور ان کی ترقی اور استحکام پر نگاہ رکھتے ہیں۔ وہ ملت اسلامیہ کے ان فرزندان دین کی بے پناہ قدر کرتے ہیں جو مساجد اور مدارس میں دین کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں۔ وہ دینی مدارس کی تقسیم اسناد کی تقاریب پر پہنچ کر اساتذہ اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ وہ ایسے غریب اساتذہ اور طلبہ کی مالی مدد کرتے اور کراتے ہیں جو دین کی خدمت کے لیے دن رات کوشاں ہیں۔ میں ایسے درجنوں علماء کرام کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو مولانا نورانی کی توجہ سے مدرسے چلا رہے ہیں۔ مجھے ایسے مفلوک الحال علماء کا علم ہے جو مولانا نورانی کی مالی خدمت کے مرہون منت ہیں۔

سیاست میں مخالفین حملے کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ پھر آج تو تشدد کا اتنا زبردست زمانہ ہے کہ اندھیرے قتل ہماری زندگی کا لازمہ بن چکے ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی پر ایسے کئی حملے بھی ہوئے قتل کے منصوبے بھی بنے اور قاتلانہ گولیاں بھی سرسرائیں۔ مگر مجال ہے کہ اس شخص نے کبھی مقدمہ، کبھی استغاثہ، کبھی فریاد اور شکایت کی ہو، سارے معاملات اللہ کے سپرد ہوتے ہیں اور اللہ حفاظت بھی کرتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ نہ صرف انہیں اللہ اپنی پناہ میں رکھتا ہے بلکہ ایسے حملہ آوروں کو ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی اسلامی تبلیغ وتربیت کے ساتھ ساتھ اپنے مریدوں کی روحانی
تربیت سے غافل نہیں ہیں۔ آج بلا مبالغہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر پچیس ہزار
سے زائد لوگ آپ سے بیعت ہیں۔ آپ سلسلہ قادریہ اور نورانیہ میں بیعت کرتے
ہیں اور اپنے مریدوں کی اصلاح احوال پر مسلسل نظر رکھتے ہیں۔ انہیں سیاسیات کی
مصروفیت سے جب بھی وقت ملتا ہے، وہ اپنے مریدوں کو خصوصی توجہ دیتے ہیں اور
ان کی اپنی محافل میں قلب وذکر کی تربیت کرتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر ان کے بہت
سے مریدوں کو جانتا ہوں جن کے اندر بڑی اصلاحی تبدیلیاں آئیں اور وہ تزکیۂ نفس
سے ہمکنار ہوئے ہیں۔

(''جہانِ رضا'' جنوری ۲۰۰۴ء)

لاہور کی چھوٹی مسجدوں کے بڑے بڑے علماء

لاہور شہر جہاں باغوں، کالجوں، سکولوں اور استادوں کا شہر رہا ہے وہاں اس کے
گلی کوچے چھوٹی چھوٹی مسجدوں سے آباد تھے۔ ان مسجدوں میں ایسے علماء کرام امامت
کروایا کرتے تھے۔ جو آج ڈھونڈے سے نہیں ملتے۔ ہم پاکستان بننے سے دس سال
پہلے کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے استاد محترم مولانا محمد نبی بخش حلوائی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ
دہلی دروازے کے باہر ایک چھوٹی سی مسجد میں قیام فرماتے تھے۔ وہ مفسر قرآن تھے۔
انہوں نے پندرہ جلدوں میں ''تفسیر نبوی'' تالیف کی تھی۔ یہ تفسیر پنجابی اشعار میں تھی
اس تفسیر نے پنجاب کے دیہات میں تہلکہ مچا دیا۔ پنجاب کے ہر گاؤں کا امام مسجد
''تفسیر نبوی'' کا مطالعہ کرتا اور اپنے نمازیوں کی اعتقادی تربیت کرتا تھا۔ مولانا محمد نبی بخش
حلوائی، مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد تھے۔ حضرت پیر عبد الغفار کاشمیری کے
مدرسہ سے پڑھے تھے۔ اور مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ اور مرید
تھے۔ آپ نے اپنی مسجد اپنی نیک کمائی سے تعمیر کی۔ کسی سے کوئی چندہ یا فنڈ نہیں لیا تھا۔
دہلی دروازے کے باہر ستی کوتوالی کی دیوار کے ساتھ یہ مسجد بنی تو اسے ''مسجد گھاس
منڈی'' کہتے تھے ان دنوں مسجد کے ساتھ مویشیوں کے چارے کی بڑی وسیع گھاس
منڈی تھی مولانا نے آہستہ آہستہ دو منزلہ مسجد بنالی۔ اور یہ ''دو منزلی مسجد'' کہلانے لگی۔
اب یہی مسجد بلند و بالا بن کر دہلی دروازے کے باہر پوری شان سے کھڑی ہے۔ اب
اس کا نام ''مسجد نبویہ'' رکھ دیا گیا ہے۔ اس مسجد میں طلبہ علماء، اور سالکان طریقت کی
تربیت ہوتی تھی۔ یہ مسجد اہل علم وفضل کا مرکز بھی تھی اور تربیت گاہ بھی تھی۔
دہلی دروازے کے باہر جہاں آج ''مسجد میلاد'' ہے۔ یہاں باغ کے کنارے

پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی جسے ہم ''باغ والی مسجد'' کہتے تھے۔اس کے امام ایک اعلیٰ
عالم دین تھے۔ نہ تنخواہ لیتے تھے نہ بچوں سے کوئی چندہ وصول کرتے تھے وہ حلال کی
روزی کے لیے گھڑیوں کی مرمت کر کے روزی کماتے اور زندگی بسر کرتے تھے مسجد کے
ساتھ ایک بہت بڑا وسیع باغ تھا۔ جہاں ''مجلس احرار، نیلی پوش'' اور خاکسار لیڈر زاینٹی
پاکستان جلسے کیا کرتے تھے۔اور کانگریس کے وظیفہ خور نیشنلسٹ مولوی پاکستان کی
تشکیل کے خلاف دھواں دھار تقریریں کرتے تھے۔وہ قسمیں اٹھا اٹھا کر لوگوں کو یقین
دلاتے تھے کہ پاکستان تو کیا کوئی مائی کالال پاکستان کی ''پ'' بھی نہیں بنا سکتا۔

اس باغ کے ساتھ ہی حضرت شاہ محمد غوث قادری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔اور ساتھ ہی
ایک بہت بڑی جامع مسجد ہے۔ کسی زمانے میں مولانا سلطان محمود جمعہ کا خطبہ دیا کرتے
تھے۔ یہ مولانا گورنمنٹ پرنٹنگ پریس میں پریس مین تھے۔مگر انہیں انگریزی عہد میں
نوٹ بنانے کا ایسا فن آتا تھا کہ ان کے بنائے ہوئے نوٹوں کے سامنے اصل نوٹ بے
حیثیت اور کھوٹے نظر آتے تھے۔وہ نوٹ بناتے مگر خود اپنے تصرف میں نہ لاتے تھے۔
بلکہ غریبوں میں بڑے حیرت انگیز اور خفیہ طریقوں سے تقسیم کیا کرتے تھے۔وزیر خاں
کی مسجد کی صفوں کے نیچے نوٹ پھنسا دیتے دن کو صفیں جھاڑنے والے مزدور ان نوٹوں کو
اٹھا کر ''غیبی امداد'' خیال کرتے صبح نماز فجر کے لیے مسجد کو جاتے تو کسی بیوہ عورت کے
صحن میں میلے کچیلے کپڑے میں نوٹ رکھ کر پھینک جاتے وہ صبح اٹھتی تو اسے ''غیبی امداد''
جان کر اپنی غربت کو دور کرتی۔سحری کے وقت کسی مزدور کو ٹوکرا اٹھائے منڈی کی طرف
جاتے دیکھتے تو اس کے آگے دور جا کر کپڑے جھاڑتے اور نوٹ زمین پر پھینک دیتے،
خود آگے چلے جاتے مزدور اس جگہ آتا۔گرے ہوئے نوٹ اٹھاتا اور آگے جانے کی
بجائے گھر آ کر سکون کا سانس لیتا۔اسی طرح دور مختلف قصبوں اور دیہاتوں میں نکل
جاتے اور طرح طرح کے لوگوں کی خفیہ طریقوں سے خدمت کرتے اور کسی کو بتائے
بغیر غریبوں کی امداد کرتے جب ان مولوی صاحب پر مقدمہ چلا تو چودہ سال سزا ہوئی۔

مگر جس دن پاکستان بنا تو تمام قیدی رہا ہو کر اپنے گھروں میں آ گئے۔مولانا اپنے گھر
آ کر گوشہ نشین ہو گئے اور بلا تنخواہ شاہ محمد غوث کی مسجد میں جمعہ پڑھانے لگے۔

حافظ محمد عالم (شیخ القرآن والحدیث خطیب دو دروازہ مسجد سیالکوٹ) جن دنوں
دار العلوم حزب الاحناف میں پڑھا کرتے تھے اکبری منڈی میں اعلیٰ والی مسجد میں
جمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ مولوی سلطان محمود کی وفات کے بعد آپ شاہ محمد غوث کی
جامع مسجد میں خطبہ دینے لگے۔ان کے سیالکوٹ چلے جانے کے بعد مولانا محمد سعید
نقشبندی جو بعد میں داتا گنج بخش کی جامع مسجد میں خطیب بنے۔مسجد شاہ محمد غوث میں
جمعہ پڑھانے لگے۔مولانا محمد سعید نقشبندی بڑے محنتی مدرس، معلّم اور عالم دین تھے۔
انہی کے حجرے میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری، مولانا محمد عبد النبی کوکب، مولانا اقبال احمد
فاروقی، مولانا قیوم الٰہی عرفانی (جو بعد میں شاہی مسجد کے خطیب بنے) اور کئی
دوسرے علماء کرام نے ''مرکزی مجلس رضا'' کا خاکہ تیار کیا، اور بنیاد رکھی۔مولانا محمد
سعید نقشبندی داتا گنج بخش کی مسجد میں خطیب بنے تو انہوں نے اس مسجد کو علم و عرفان کا
گہوارہ بنا دیا۔ ''کشف المحجوب'' کا درس دیتے ''مکتوبات امام ربانی'' کی تشریح
کرتے۔ پھر بہت سی کتابوں کی تصنیف و تالیف کر کے ایک علمی مقام حاصل کیا۔

دہلی دروازے کے اندر ایک ''چنگڑ محلہ'' ہے۔جس کے اندر حزب الاحناف نے علم و
فن کے دریا بہا دیئے! اس محلے کے آغاز میں سید حیدر شاہ صاحب کا گھر تھا۔سید صاحب
بڑے دولت مند تھے۔ان کے گھر کے اندر ریشم اور کمخاب کے بستر اور پردے ان کے
گھر کی رونق کو دو بالا کرتے تھے۔وہ بڑے شاہ خرچ تھے جس بازار میں چلے جاتے
ہزاروں روپے کا سامان لاتے۔ یہ تحریک پاکستان کا زمانہ تھا۔لیکن سید حیدر شاہ ہمیشہ
ہندو سیٹھوں سے چیزیں خریدتے تھے۔ان کے اس رویہ پر مسلمانوں کو بڑا دکھ تھا۔
مسلمانوں کا ایک وفد سید صاحب کے گھر آیا اور انہوں نے ترغیب دی کہ آپ ہندو
سیٹھوں کی بجائے اپنے مسلمان دکان داروں سے سودا سلف خریدا کریں۔اس وفد

میں ایک گمٹی بازار میں کپڑے کا مسلمان تاجر بھی تھا۔ جس نے یقین دلایا کہ اگر وہ
ہمارے بازار میں آئیں تو ان کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ سید صاحب نے وفد کے
اراکین کو بتایا کہ ان کے پاس ایک ''عمل'' ہے۔ وہ دن کو جو کچھ خریدتے ہیں رات
کے وقت سارے روپے ان کے گھر آجاتے ہیں۔ اس لیے میں نہیں چاہتا کہ کسی مسلمان
کا نقصان ہو ان حضرات نے آپ کی یہ بات مذاق میں ٹال دی اور اصرار کیا کہ آپ
ہم سے سودا خریدیں دکاندار نے کہا کہ آپ میری دکان پر آئیں ایسی کوئی بات نہیں ہو
گی سودا اچھا ملے گا۔ روپیہ محفوظ رہے گا۔ سید حیدر شاہ گئے تین ہزار کا کپڑا خریدا روپے
دیئے گھر آ گئے دکاندار یہ روپے احتیاط کے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ بیوی کو دیئے تاکید
کی کہ انہیں سنبھال کر رکھیں مگر دوسرے دن روپے مانگے تو روپے غائب تھے اس
زمانے میں تین ہزار کی بڑی حیثیت تھی۔ مسلمان دکاندار روتا پیٹتا دوستوں کے پاس
گیا قصہ سنایا مگر سب حیران تھے اب وہ شاہ صاحب کو کیا کہہ سکتے تھے۔

دہلی دروازے کے بازار میں ''مولوی نیاز علی کی مسجد'' تھی۔ مولوی نیاز علی
''عملیات'' کے بڑے ماہر تھے۔ لوگ تعویذ لے جاتے۔ شفاء پاتے۔ نہ روپیہ لیتے،
نہ کسی سے کچھ مانگتے۔ ہم بھی بخار، سر درد اور کئی بیماریوں کے وقت مولوی نیاز علی کے
پاس جاتے، تعویذ لاتے، شفاء پاتے، بس کسی مسجد میں ایک جھاڑو رکھنا ہوتا تھا۔

دہلی دروازہ کے بازار کی شمالی گلی میں ایک مسجد میں مولانا عبدالغفور نقشبندی
ہزاروی امامت کرتے تھے۔ قرآن پڑھتے تو لطف آجاتا۔ جہاں ہم جمعہ کی نماز سے
پہلے خطاب کرتے تھے وہ نماز جمعہ پڑھاتے تھے۔ ان کی آواز اور قرآن سن کر نمازی
جھوم جھوم جاتے تھے۔

ان کی مسجد سے تھوڑی دور آگے بڑھیں تو قاری عطاء اللہ صاحب قادری (ان
دنوں دبئی ریڈیو پر ''صوۃ القرآن'' کے انچارج ہیں) کے والد حافظ غلام محمد امامت
کرایا کرتے تھے۔ حافظ قرآن تھے اور ان گلی کوچوں میں درجنوں حافظ ان کے شاگرد

تھے۔ حجرے میں رہتے تھے، زمین پر سوتے تھے، قرآن پڑھاتے اور بچوں کو حافظ
بناتے، نہ طمع نہ لالچ، مگر جدھر جاتے لوگ جھک کر سلام کرتے۔ حافظ غلام محمد کی مسجد
سے تھوڑا سا آگے بڑھیں تو مسجد وزیر خاں کی طرف نکلنے والی گلی کے ایک کونے میں
''مولوی تاج الدین کی مسجد'' تھی لوگوں میں مشہور تھا کہ اس مسجد میں جنات کا پہرا
ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے یہاں حافظ صدر الدین (نابینا) امامت کرایا کرتے تھے۔
ہمارا ان حافظ صاحب سے بڑا رابطہ تھا۔ حافظ صدر الدین پٹیالہ (پنجاب) کے رہنے
والے تھے۔ مگر بلاء کے ذہین تھے وہ نابینا ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے ریڈیو
ٹرانسسٹر بنا لیتے تھے ہم لوگ ان کے ہاتھ سے بنے ہوئے ٹرانسسٹروں سے ہیڈ فون
لگا کر ریڈیو پروگرام سنتے رہتے تھے۔ نہ بجلی، نہ بیٹری کے سیل بس ''سورج مکھی، کا ایک
دانہ ایک کوائل اور ایک ہیڈ فون لگا کر ایریل سے ریڈیو کے پروگرام سن لیتے تھے۔
ان کے بنے ہوئے ٹرانسسٹر ہم دور دراز دیہات میں لیجا کر ریڈیو سنتے رہتے تھے۔
حافظ صدر الدین رات کے وقت اپنی مسجد کے پنکھے اتار کر اندھیرے میں انہیں گریس
دیتے، انہیں صاف کرتے اور پھر چھت سے لٹکا کر رواں دواں کر لیتے ان چیزوں کے
ساتھ ساتھ دن کے وقت وہ قرآن پاک کے حفظ کی کلاس لیتے اور بچوں کو قرآن
پڑھاتے۔ آپ کے بہت سے شاگرد آج بھی مختلف اداروں میں کام کر رہے ہیں۔ تقسیم
ملک کے وقت ہمارا زیادہ وقت حافظ صدر الدین کے پاس گزرتا تھا وہ خوش الحان
قاری تھے، تجوید پر عبور حاصل تھا قاری فضل کریم نے امرتسر سے آکر جب ''موتی مسجد''
میں مدرسہ ''تحفیظ القرآن'' جاری کیا تو حافظ صدر الدین ان کے نگران تھے۔

مولوی تاج دین کی مسجد سے نکل کر سڑک عبور کریں تو مسجد وزیر خاں اپنے پرشکوہ
انداز میں کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کے بلند و بالا مینار، محراب و منبر، در و دیوار مغل دور کی
نقاشی کا بے مثال نمونہ ہیں۔ یہ اندرون شہر کی عظیم الشان مسجد ہے۔ اس کے خطیب
اعظم مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ تھے مگر مسجد وزیر خاں بلند پایہ علمائے
کرام کی بدولت لاہور کے مسلمانوں کا دینی مرکز تھی۔ یہاں قاری محمد طفیل نے امرتسر

سے آ کر جب بساط تدریس بچھائی تو طلبہ کے جمگھٹے لگ گئے وہ نہایت خوش آواز قاری تھے۔ وہ قرآن پڑھتے تو مسجد کے در و دیوار گونج اٹھتے۔ ہم تراویح پڑھ کر قاری محمد طفیل کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کی دلکش آواز میں قرآن سن کر محظوظ ہوتے ان کے زمانے میں مسجد وزیر خاں نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوتی تھی جب حزب الاحناف کے سالانہ جلسے ہوتے تو سارے پنجاب سے لوگ کھنچے چلے آتے۔

یکی دروازے کے اندر ایک ''حویلی میاں خاں'' تھی اس کی مسجد میں حافظ عبدالعزیز امامت کرواتے تھے۔ حافظ عبدالعزیز کے زیر کمانڈ ایک ٹیم تھی جس میں حافظان قرآن، درویش، اور طلبہ تھے۔ شہر میں جہاں قرآن خوانی ہوتی، ایصال ثواب کی محفل ہوتی یا کوئی اور تقریب ہوتی تو حافظ عبدالعزیز کی ٹیم پوری ذمہ داری سے اہتمام کرتی، حافظ صاحب ختم پڑھتے اور ایصال ثواب کے لیے لمبی دعا کرتے، اور جب کھانے کا وقت آتا تو وہ پلاؤ اور قورمہ کی کئی کئی پلیٹیں کھا جاتے۔ ہمیں خوف آتا کہ یہ کھانا کس طرح ہضم کریں گے۔ حافظ صاحب کا معمول تھا کہ رات کو مصلے پر کھڑے ہو جاتے دو سو نفل ادا کرتے۔ نصف قرآن پاک پڑھتے پھر تہجد کا وقت آ جاتا اس کے بارہ نوافل پوری سورتوں کے ساتھ ادا کرتے۔ صبح کی جماعت کرانے کے بعد لاہور کے مختلف مزارات کی زیارت کو نکل جاتے اور کم از کم دس میل پیدل سفر کرتے ہم نے ان کی بسیار خوری کو معاف کر دیا اور شب بیداری کو دیکھ کر ان کے خلاف اپنے جذبات کو ٹھنڈا کر دیا کرتے۔

ہم نے آج کی محفل میں ان علمائے کرام کا ذکر کیا ہے جنہیں ہم نے دیکھا تھا، ملاقاتیں کی تھیں اور ان کے شب و روز کے مشاغل کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اب قارئین کی مرضی ہے کہ وہ لاہور کی چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے ان بڑے بڑے علماء کرام کو جس انداز سے چاہیں دیکھیں۔

(''جہانِ رضا'' فروری، مارچ ۲۰۰۴ء)

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی علماء کے جھرمٹ میں

نماز صبح کے بعد مراقبے میں گردن جھکائے بیٹھے تھے کہ دروازے کی گھنٹی کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو افق پر دور سورج ابھرتا ہوا نظر آیا۔ دوسری نظر دیکھا تو سامنے ایک بہت خوبصورت کار کھڑی تھی اس میں سے ایک نورانی شخص نکلا جو سر پر ''تاجِ سمنان'' سجائے تھا۔ یہ حضرت پیر طریقت ڈاکٹر محمد مظاہر اشرف الاشرفی الجیلانی کھڑے ہیں۔ دوڑ کر ہاتھ چومے اور اندر لا کر بٹھایا ہم کبھی حضرت پیر اشرفی کو دیکھتے کبھی اپنے گھر کو!

ڈاکٹر محمد مظاہر الاشرفی الجیلانی ''حلقہ اشرفیہ پاکستان'' کے صدر نشین ہیں۔ وہ سلسلۂ اشرفیہ سے وابستہ پاکستان، ہندوستان اور یورپ کے ہزاروں مریدوں کی تربیت کرتے ہیں۔ کچھوچھا شریف کے وابستگان آپ سے نہ صرف عقیدت رکھتے ہیں بلکہ آپ سے روحانی رہنمائی بھی حاصل کرتے ہیں۔ آپ کو یہ نسبت خانوادہ اشرفیہ سمنان سے ملی ہے۔ ڈاکٹر محمد مظاہر اشرف روحانی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ امراضِ قلب کے ماہر ڈاکٹر بھی ہیں۔ وہ لاہور (شادمان) کراچی اور لندن میں روحانی مجالس قائم کرتے ہیں۔ ماہنامہ ''آستانہ'' کراچی کے چیف ایڈیٹر ہیں اور اس میں روحانی بیماریوں کے علاج پر آپ کا ایک مستقل کالم چھپتا ہے۔ آپ نے اپنے روحانی خانوادے کی کئی کتابیں شائع کر کے تقسیم کی ہیں۔ ہم جب بھی درِ دولت پر دستک دیتے ہیں تو آپ کے مریدوں کا ایک حلقہ آپ کی روحانی مجلس میں موجود ہوتا ہے۔ وہ ہمیں بھی خصوصی توجہ سے نوازتے ہیں اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر کے ہماری رہنمائی فرماتے ہیں۔ آج جب وہ ہمارے غریب خانہ پر تشریف لائے تو ہمیں

امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کا شعر یاد آیا!

خرم رسیدہ ام شب کہ نگار خواہی آمد
سرِ من فدائے راہے کہ سوار خواہی آمد

مولانا کوکب نورانی کو خدا خوش رکھے۔ وہ لاہور آئے تو ایک جلسے میں خطاب کیا۔ اور ہمیں بھی اپنے ساتھ رکھا۔ وہ مغلپورہ لاہور کے رات کے جلسے میں واقعی کوکب نورانی بن کر چمکے۔ حاضرین نے انہیں تحریروں اور ٹی وی کے مختلف چینلز پر تو سنا تھا مگر آج پہلی بار انہیں اپنے سامنے سن کر جھوم جھوم گئے۔ وہ رات گئے تک اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرتے رہے۔ اگرچہ ان کی آواز میں روایتی مقرروں کی طرح گرج اور چمک تو نہ تھی، مگر سامعین کے دلوں پر ''کوکب الدری'' بن کر نور بکھیرتے گئے۔ ہم نے دیکھا کہ تقریر کے دوران مولانا کوکب نورانی کے چہرے پر بیک وقت دس ہزار آنکھیں جمی ہوئی تھیں۔ مگر ان کی زبان سے پھول بکھرتے جا رہے تھے۔

پھولوں کی ہیں ہزار زبانیں مگر خموش
بلبل کا ایک نغمہ مگر گونجتا ہوا!

یہ لاہور کے ایک جلسے کی جھلک تھی۔ ویسے مولانا کوکب نورانی موجودہ دور میں علمائے اہل سنت کی ایک منفرد شخصیت ہیں۔ جو ہر محاذ پر صبح و شام مصروف عمل رہتے ہیں۔ ان کی تقریر کے علاوہ ان کی تحریر نے بھی اپنا لوہا منوایا ہے۔ وہ بدعقیدہ علماء پر ''رضا کے نیزے کی مار'' بن کر حملہ کرتے ہیں مگر جب افکار رضا کا اظہار کرتے ہیں تو ''جوئے نغمہ خواں'' بن جاتے ہیں۔ وہ دنیا کے گوشے گوشے تک پروازیں کرتے رہتے ہیں اور واپسی پر ہمارے قارئین ''جہان رضا'' کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں۔ وہ شب و روز کام کرتے ہیں اور کام کرتے تھکتے نہیں۔ ہم جب کبھی علمائے اہل سنت کا تذکرہ کرتے ہیں تو ہماری مجالس میں ان کی یادیں، نسیم بہاری بن کر چلی آتی ہیں۔

مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ کے احباب نے ان کی یاد میں الحمراء ہال

لاہور میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ جس میں ملک کے مقتدر اور مایۂ ناز علمائے کرام تشریف لائے اور ان کی علمی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ ان کے ہمعصر علمائے کرام اور شاگردوں کی کثیر تعداد ہال میں موجود تھی۔ ہمیں ان کی یاد نے آ لیا۔ اور ہم نے چشمِ تصور میں دیکھا کہ وہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ''فتاویٰ رضویہ'' کے دفتر کھولے بیٹھے ہیں اور ہماری انگلی پکڑ کر فتاویٰ رضویہ کے ان اوراق پر پھیر رہے ہیں جو ان کی کوششوں سے تخریجات و توضیحات کے ساتھ ۲۸ جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ آج دنیائے رضویت کے کئی اہل علم و قلم اعلیٰ حضرت کے علمی اور فقہی کمالات کو سامنے لانے میں مصروف ہیں۔ مگر مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی کی نگرانی میں ''فتاویٰ رضویہ'' جس شان سے مرتب ہوا اس کی مثال نہیں ملتی۔ آج ''فتاویٰ رضویہ'' کی ۲۸ جلدیں فقہی دنیا کی رہنما ہیں۔ جب ہم علمائے کرام کے علاوہ وکلاء اور ججز کی الماریوں میں ''فتاویٰ رضویہ'' کو جگمگاتا دیکھتے ہیں، تو دل خوش ہو جاتا ہے۔ مفتی محمد عبدالقیوم ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ ہماری یادوں میں اپنی تدریسی، علمی اور مسلکی خدمات کی وجہ سے تو دمِ آخر رہیں گے مگر دنیائے علم و فضل میں ''فتاویٰ رضویہ'' کی تدوین ان کا اتنا بڑا کارنامہ ہے جو انہیں صدیوں زندہ و تابندہ رکھے گا۔ نور اللہ مرقدہ!

مولانا محمد رفیق مجاہد نقشبندی، آزاد کشمیر کے ایک پہاڑی گاؤں ''کڈھالہ'' میں ''بوستانِ نقشبندیہ'' کی آبیاری کر رہے ہیں۔ وہ ہمارے دوست ہیں لاہور آتے ہیں تو ملاقات سے نوازتے ہیں۔ اپنی کارکردگی سے آگاہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد مسعود احمد مظہری کی علمی خدمات کو بڑی محبت سے بیان کرتے ہیں۔ ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا (کراچی) کی تالیفات کو عام کرنے میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ''حیاتِ اعلیٰ حضرت'' مؤلفہ مولانا ظفر الدین قادری چھپی تو مکتبہ نبویہ سے ایک سو سیٹ لے گئے اور آزاد کشمیر کی دور دراز وادیوں میں پہنچاتے رہے۔ وہ نقشبندی ہیں، مگر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب سے محبت، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا سے رفاقت اور اعلیٰ حضرت

فاضلِ بریلوی کی کتابوں کی تقسیم میں شبانہ روز کام کرنا ان کی مجاہدانہ زندگی کا حصہ ہے۔ پھر ہم جیسے نیازمندوں کو نوازنا ان کی اعلیٰ حضرت عظیم البرکت کی ذات کے ساتھ محبت کی علامت ہے۔ جب وہ ہماری مجالس میں تشریف لاتے ہیں تو ہم انہیں ''مجاہدِ رضویت'' جان کر علمائے کرام کا مقام دیتے ہیں۔ جب ان کے خوبصورت خط آتے ہیں تو ہم انہیں پڑھ کر باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ انہیں جب ''جہانِ رضا'' ملتا ہے جب تک اسے پڑھ نہ لیں، سونے کا نام نہیں لیتے۔ ادام اللہ تعالیٰ عمرہٗ۔

عزیزم ضیاء الحسن اشرفی، لالہ موسیٰ سے چل کر ایک عرصہ کے بعد ''جہانِ رضا'' کے دفتر میں آ گئے۔ ضیاء الحسن اشرفی، معروف عالمِ دین حضرت علامہ غلام قادر اشرفی کے نواسے ہیں۔ علامہ غلام قادر نے پاکستان بننے کے بعد ساری زندگی لالہ موسیٰ (گجرات) میں گزاری۔ وہ ان بزرگوں میں سے تھے، جن کی گفتگو عالمانہ تھی اور باتیں دلآویز۔ وہ ہندوستان کی ریاست فرید کوٹ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان میں زبردست کام کیا۔ وہ سنی کانفرنس (بنارس) میں ایک متحرک کارکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ پاکستان بنا تو ہجرت کر کے چلے آئے اور ''لالہ موسیٰ'' (گجرات) میں قیام پذیر ہوئے۔ جن دنوں ہم علمائے اہلسنّت کی مجالس میں ایک خدمت گزار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ تو مولانا غلام قادر اشرفی میر محفل ہوتے تھے۔ انہوں نے سیاسی اور دینی تحریکوں میں بھرپور حصہ لیا۔ پھر بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کیا۔ وہ زندگی کے آخری ایام میں ''دیارِ حرم'' کی حاضری میں زیادہ وقت گزارتے۔ مدینہ منورہ جاتے تو حضرت مولانا ضیاء الدین قادری خلیفہ اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی مجالس میں اپنا وقت گزارتے۔ وہ ان کے نہایت ہی قریبی احباب میں شمار ہوتے تھے ہم ان کی مجالس میں بیٹھتے تو وہ ملکی اور سیاسی حالات کے ساتھ ساتھ دیارِ حبیب کی یادوں سے ہمارے دل کو باغِ جناں بنا دیتے۔ وہ ہمیں خصوصی نگاہوں میں رکھتے تھے۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری بانی ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے

خاص احباب میں سے تھے۔ حکیم اہلسنّت، جب حج کو گئے تو کئی ماہ دیارِ حبیب میں ٹھہرے رہے۔ مولانا غلام قادر اشرفی ان کے رفیق مدینہ تھے۔ اعلیٰ حضرت کے افکار ونظریات پر انہیں بڑی دسترس تھی۔ بات کرتے تو بریلی کی بہاریں سامنے آ جاتیں۔ آج ان کے نواسے ضیاء الحسن اشرفی نے آ کر ان کی یادوں کو تازہ کر دیا۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ مولانا غلام قادر اشرفی اپنے نواسے کو گود میں اٹھائے۔ ہمارے پاس لے آئے ہیں یا یوں لگا جیسے ضیاء الحسن اشرفی اپنے نانا جان کا دامن پکڑ کر ہمیں سرفراز کرنے کے لیے ''جہانِ رضا'' کے دفتر میں آ گئے ہیں۔

آج ہم علمائے کرام کی یادوں کی محفل سجائے بیٹھے تھے، تو ڈاک آ گئی۔ ہم بیٹھے بیٹھے سیکڑوں علمائے کرام کی یادوں میں گھر گئے اور ''جہانِ رضا'' کے قارئین کے حلقہ خلوص میں شادکام ہونے لگے۔ بمبئی (انڈیا) سے عزیزِ گرامی زبیر خان قادری اپنے ''افکارِ رضا'' کے دو بنڈل اٹھائے دفتر میں آ پہنچے۔ علامہ ارشد القادری کے پوتے علامہ خوشتر نورانی ''جامِ نور'' کے پچاس جام انڈیل کر چلے گئے۔ حضرت علامہ یٰسین اختر مصباحی دہلی سے چلے اور اپنے ''کنز الایمان'' کی پچاس جلدیں عنایت کر کے غیب ہو گئے۔ مبارک پور انڈیا سے، علامہ مبارک حسین مصباحی اپنے ماہنامہ ''الاشرفیہ'' کے ''سیدین نمبر'' کی چالیس جلدیں لے کر آئے اور دیکھتے دیکھتے غیب ہو گئے۔ ہم نے پکارا تو جاتے جاتے اپنی خوبصورت کتاب ''افتراق بین المسلمین کے اسباب'' عنایت فرماتے ہوئے کہنے لگے اب اس کی پانچ ہزار جلدیں چھپوا کر پاکستان میں تقسیم کریں۔ لوگ مجھے بار بار تقاضوں سے نوازتے رہتے ہیں۔ حضرت علامہ حبیب البشر خیری رنگون سے پرواز کرتے ہوئے تشریف لائے۔ ''تحفہ درود شریف'' کی نہایت ہی خوبصورت ایک جلد عنایت فرمائی اور فرمانے لگے کہ یہ حضور نبی کریم ﷺ کا تحفہ ہے اسے اہلِ محبت تک پہنچاؤ۔

ان سارے علمائے کرام کی کرم فرمائیاں اور ''جہانِ رضا'' کے قارئین کے خطوط

ہم پر بارانِ رحمت بن کر برستے رہے اور ہم ان کی یادوں کی خوشبو سے دل و دماغ کو معطر کرتے رہے۔ ابھی ہم ان خطوط کے مطالعہ سے سرشار ہی تھے کہ گھنٹی بجی اور ہماری جیب کا ''ہدہد رنگیں نوا'' یادِ مدینہ لایا۔ مدینہ پاک میں ہمارے ایک دوست حکیم محمد عارف ضیائی مدنی شہرِ محبت میں تیس سال سے قیام پذیر ہیں۔ وہ تین سال تک شہرِ محبت کی جیل میں رہنے کے بعد کراچی پہنچے تھے اور ہم سے بات کر رہے تھے۔ حکیم محمد عارف ضیائی ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے بانی حضرات میں سے ہیں۔ وہ ''مجلسِ رضا'' کے پہلے صدر تھے۔ انہوں نے حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے ساتھ کئی سال کام کیا اور اعلیٰ حضرت کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچایا۔ آج تیس سال ہو گئے ہیں مدینہ منورہ میں پہنچے۔ مولانا ضیاء الدین قادری خلیفہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی تربیت میں ایک عرصہ گزارا۔ ان کے وصال کے بعد ان کے بیٹے حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہے پھر مدینہ پاک میں ''کوچۂ جاناں'' میں ایک آشیانہ بنا کر بسر اوقات کرتے رہے ہر ماہِ رمضان میں وہ بارگاہِ رسول میں اپنا دستر خوان بچھاتے اور اہلِ محبت کو افطاری کرواتے۔ ہم ان کے دستر خوان پر حاضر ہوتے تو اپنے پہلو میں بٹھا کر افطاری کرواتے۔ جب ہم جدا ہوتے تو ''خصوصی انعامات'' سے نوازتے۔ اگرچہ وہ ایک طویل عرصہ تک دیارِ حبیب میں رہے۔ مگر آخر کار نجدیوں نے ان کی محبت رسول کو ''شرک و بدعت'' کا نام دے کر پسِ ''دیوارِ زنداں'' رکھا۔ آج آزاد ہوئے تو کراچی سے ان کی آواز آئی۔ ان کی یادیں تازہ ہو گئیں اور ہم ان کی یادوں کی خوشبوئیں اپنے قارئین تک پہنچا رہے ہیں۔

آنے والو! یہ تو بتاؤ شہرِ مدینہ کیسا ہے؟
سر اُن کے قدموں میں رکھ کر جھک کر جینا کیسا ہے؟

میاں جمیل احمد شرقپوری پیر طریقت ہیں۔ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی عظیم خانقاہ شیر ربانیؒ [illegible]ر شریف کے سجادہ نشین ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی علمی اور

روحانی خدمات سرانجام دینے میں گزاری۔ خصوصاً حضرت مجدد الف ثانی کے افکار و نظریات کی اشاعت میں مؤثر انداز میں کام کرتے رہے۔ وہ خانقاہ سے نکل کر میدانِ سیاست میں آئے تو ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ مولانا الشاہ احمد نورانی مرحوم کی قیادت میں ''جمعیت العلماء پاکستان'' کے جھنڈے تلے ''نظامِ مصطفیٰ'' کے لیے بڑا کام کیا۔ ''تحریکِ نظامِ مصطفیٰ'' میں صفِ اول میں کھڑے تھے۔ انتخابی میدان میں نکلے تو انہیں قوم نے ووٹ بھی دیئے اور ''عقیدت کے نوٹ'' بھی نچھاور کیے۔ قید و بند میں رہے تو جیل خانے کو روحانیت کی خوشبوؤں سے معمور کر دیا۔ انہوں نے اپنے تین بیٹوں کی اچھے انداز میں تربیت کی۔ ایک پیر بنا تو ساحل سمندر سے لے کر کوہ قراقرم کی وادیوں تک مریدوں کا حلقہ قائم کرتا گیا۔ ایک میدان سیاست میں اترا۔ تو پنجاب اسمبلی کا جاندار رکن بنا۔ ایک تجارت میں نام پیدا کرنے کے بعد اٹھا تو بڑے بڑے سیاسی بتوں کو گرا کر قومی اسمبلی کا رکن بنا۔

میاں جمیل احمد شرقپوری نے ایک طویل عرصہ علالت میں گزارا۔ اب وہ بڑھاپے کی وادی سے گزر رہے ہیں مگر ان کی ہمت کا یہ عالم ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات کو مربوط کرنے کے لیے علماء کی محفلیں سجاتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات کو عام کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ آپ نے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی روحانی تعلیمات پر اہلِ علم و قلم سے کئی کتابیں لکھوائیں اور سلسلہ مجددیہ کی کتابوں کے ترجمے کروا کر مفت تقسیم کیے۔ آپ نے اپنے روحانی حلقے میں سلسلہ مجددیہ کی تربیت کرتے ہیں۔ آپ کا رسالہ ''نور اسلام'' پچاس سال ہوئے جاری و ساری ہے۔ ''شیرِ ربانی ڈائجسٹ'' انگریزی میں نکالتے ہیں۔ ''حوزۂ نقشبندیہ'' میں دورِ حاضر کے نقشبندی اور مجددی حضرات کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ میاں جمیل احمد شرقپوری ایک بے نیاز پیر ہیں۔ وہ بے اعتنائی پر آئیں تو کروڑ پتی مریدوں و دروازے کے باہر کھڑے ہونے کا حکم دیں۔ نوازنے کو آئیں تو ہم جیسے فقیر بے نوا

ے گھروں پر علی الصبح ''چھاپے'' مار کر خوش کر دیں۔ ہم نے انہیں زندگی کا طویل سفر کرتے دیکھا ہے۔ وہ روایتی سجادہ نشینوں کی طرح دنیا داروں کے پیچھے کبھی نہیں بھاگتے اور نہ ہی وہ اہلِ علم سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کی شام آتے دیکھی تو اپنی لاکھوں روپے کی نادر کتابیں پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو بخش دیں۔ وہ اکثر علمائے کرام اور سکالرز کی مجالس میں بیٹھتے ہیں اور حضرت مجدد الف ثانی کی تعلیمات پر لکھنے کے پروگرام دیتے جاتے ہیں۔ کیا آپ کو ایسا پیرِ طریقت پسند آیا؟

چلے تو راہِ طریقت کا شاہسوار لگے
رُکے تو ''شیرِ ربانی'' کا شاہکار لگے

(''جہانِ رضا'' اگست، ستمبر ۲۰۰۴ء)

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا محمد نبی بخش نقشبندی المتخلص بہ حلوائی لاہوری قدس سرہ العزیز (م ۱۹۴۴ء) انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے دوران قطب الارشاد شہر لاہور میں پیدا ہوئے۔ تعلیم حاصل کی اور ایک سنی العقیدہ جید عالم دین کی حیثیت سے علمی دنیا میں متعارف ہوئے۔ ایک قادر الکلام پنجابی شاعر کی حیثیت سے شہرت سخن وری پائی۔ ایک مفسر قرآن حکیم کی حیثیت سے اہل علم وفضل سے داد وتحسین حاصل کی۔ اپنی نظریاتی اور ناقدانہ طرز نگارش میں ممتاز ہوئے۔ تبلیغی مساعی کی وجہ سے پنجاب بھر میں تبلیغی فرائض کو سرانجام دیتے رہے۔ سادہ بود و باش کی وجہ سے فقیر بے نوا بنے اور ریاضت ومجاہدہ کی بنا پر سلسلہ نقشبندیہ کے مشائخ عصر سے خرقۂ خلافت حاصل کیا۔ ایک مدرس، معلم، مفسر اور سالک راہ طریقت ہونے کی وجہ سے ہزاروں شاگردوں، متعلموں، قارئین، مریدین اور عقیدت مندوں کے ممدوح ومحبوب رہے۔

۱۹۳۷ء میں حضرت مولانا نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی درسگاہ دور ودراز کے طلبہ کو دعوت علم دے رہی تھی۔ دہلی دروازے کے باہر کوتوالی کی شمالی دیوار کے ساتھ آپ نے ایک مسجد تعمیر کرائی جو دو منزلہ ہے۔ یہی مسجد آپ کی خانقاہ تصوف تھی، درسگاہ طلبہ تھی، ادارۂ تصنیف وتالیف تھی اور مرکز رشد وہدایت تھی۔ اس درسگاہ میں ان دنوں تقریباً تیس طلبہ علم دین حاصل کرتے تھے۔ سیکڑوں علماء کرام ملاقات کو آتے۔ دینی موضوعات پر گفتگو کرتے۔ آپ کے خیالات سے بہرہ اندوز ہوتے۔ ذکر وفکر کے رسیا اسی مسجد کی راتیں زندہ رکھتے اور صبح کی نماز کے بعد حضور پرنور پر درود کا حلقہ

ہوتا جس میں طلبہ وعلماء، مسافر و درویش، فقیر و امیر، مہمان و میزبان سب شریک ہوتے۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ حضرت کی مجلس میں بیٹھنے والے لوگ فقیر بھی تھے اور بے نظیر بھی۔

ع تیری محفل میں بیٹھنے والے آدمی بے نظیر ہوتے ہیں!

حضرت مولانا کی خالی از تکلف اور سادہ زندگی ایک فقیر بے نظیر کی مثالی زندگی تھی۔ مجلس میں بیٹھتے تو امتیاز کہ و مہ نہ ہوتا۔ خود گفتگو کم کرتے مگر لوگوں کو بات کرنے کا زیادہ موقع دیتے۔ لباس عامی، قصوری لنگی، سفید ململ کا کھلا کرتا، سر پر سفید درویشانی ٹوپی، نرم اور سرخ کھال کی گامے شاہی جوتی، لوگ دور دور سے آتے، علوم و اسرار کی جھولیاں بھر کر اٹھتے۔ سالکان طریقت روحانی تربیت پاتے۔ علماء مسائل اعتقادیہ پر گفتگو کرتے۔ طالب علم "قال اللہ و قال الرسول" کی دولت سے مالا مال ہوتے۔

۱۹۳۹ء میں آپ "تفسیر نبوی پنجابی" کی پندرہ مبسوط جلدوں کی تالیف اور طباعت سے فارغ ہو چکے تھے اور بعض حصوں کے کئی کئی ایڈیشن زیور طبع سے آراستہ ہو کر پنجاب بھر میں پھیل چکے تھے۔ یہ تفسیر ایک طرف علم و فضل کا خزینہ تھی، پنجابی شاعری کا ایک ذخیرہ تھی، دوسری طرف اپنے دور کے دینی فتنوں اور اعتقادی ناہمواریوں کا جواب تھی۔ آپ نے نظریاتی اختلافات کو ہوا دینے والے مولفین کا بڑا زوردار جواب دیا۔ تفسیر محمدی پنجابی کے مباحث کو رد کیا۔ دل پذیر کے نظریات پر تنقید کی۔ تفسیر نعمانی پر گرفت کی۔ علماء دیوبند کے نظریات کی چھان پھٹک کی، فتنہ مرزائیت کے جواب میں کتابیں لکھیں اور نیچری تاویلات کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ تفسیری کارناموں سے ہٹ کر آپ نے بعض مسائل پر مستقل کتابیں لکھیں جو ہزاروں کی تعداد میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر اہل علم کے مطالعہ میں آئیں۔ صحابہ کرام کی ذات بابرکات کو ہدف تنقید بنانے والے رافضی خصوصاً حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ سے بغض رکھنے والے شیعوں کے جواب میں النار الحامیہ لمن ذم المعاویہ لکھی۔ اسمٰعیل دہلوی

کے عقائد کے رد میں "شموس الوہابیہ" لکھی۔ مساجد میں فتنہ برپا کرنے والے وہابین کے خلاف "اخراج الوہابین من المساجد المسلمین" لکھی۔ نبی مکرم کے درود پاک کے منکرین اور مانعین کے جواب میں "اظہار انکار المنکرین من الصلوٰۃ المحبین" لکھی۔ پھر اہل محبت اور خلوص کے دلوں کو حضور نبی مکرم ﷺ کے درود پاک کی اہمیت اور فضیلت سے روشن کرنے کے لیے کتاب "شفاء القلوب" پنجابی شعروں میں لکھی۔ نعتوں کے کئی مجموعے لکھے۔ پنجابی، فارسی، عربی اور اردو میں مولود شریف، مناقب اور حمد و ثناء پر بہت سے رسالے لکھے۔

۱۹۴۰ء کے اوائل میں آپ کے سامنے نظریاتی مباحث پر دو کتابیں آئیں۔ ایک "انوار آفتاب صداقت" جسے فضل احمد انسپکٹر لودھانوی نے لکھا اور طبع کرایا۔ اور دوسری کتاب "جاء الحق و زہق الباطل" جسے مفتی احمد یار خاں صاحب نعیمی قدس سرہ (مولف تفسیر نعیمی) نے گجرات سے شائع کیا۔ یہ دونوں کتابیں دیوبندی نظریات کا زبردست جواب تھیں اور اہل سنت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ایک کامیاب کوشش تھی۔ حضرت مولانا ان دونوں کتابوں سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ دونوں فاضل مولفین کے پاس خود سفر کر کے گئے، ہدیہ تبریک پیش کیا، داد و تحسین دی، حوصلہ افزائی کے لیے کئی کئی جلدیں خرید کر عوام میں تقسیم کیں پھر یہ محسوس کیا کہ تمام اختلافی امور پر ایک مبسوط اور بھرپور کتاب لکھنے کی ابھی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے "الامتیاز بین الحقیقت والمجاز" کا مسودہ تیار کرنے میں کئی سال وقف کر دیے۔ ہزاروں حوالے کی کتابیں سامنے رہیں اور کم از کم دو سو اختلافی مسائل کو نظریات کا تقابلی جائزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس مفید کتاب کا تقریباً تین ہزار صفحات پر پھیلا ہوا مسودہ ابھی تک اشاعت پذیر نہیں ہو سکا۔

تصنیف و تالیف کی دنیا سے ہٹ کر آپ نے ایک سالک طریقت کی حیثیت

سے وقت کے مشائخ کی خدمت میں تربیت حاصل کی۔ معمولاتِ اولیاء کو اختیار کیا۔
مجاہدہ و ریاضت کی منزلیں طے کیں۔ اپنے پیرومرشد حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری
ہاشمی، خلیفہ خاص حضرت دائم الحضوری رحمۃ اللہ علیہما سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ ان
کے وصال کے بعد حضرت پیر سید جماعت علی شاہ ثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے
زانوئے عقیدت تہ کیا، منازل سلوک طے کیے اور پھر خرقہ خلافت حاصل کیا۔ یہ
دونوں مشائخ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کی معروف شخصیتیں تھیں۔ ان حضرات کا روحانی
فیضان مولانا محمد نبی بخش حلوائی کی زبان قلم کی وساطت سے ہزاروں طالبان حق تک
پہنچا۔ سیکڑوں مریدوں نے، آپ کے زیر نگاہ رہ کر تربیت حاصل کی، مقامات سلوک
طے کیے۔ شب بیداری، قیام اللیل، کثرت درود اور معمولات اولیاء نقشبند کی نعمت
حاصل کی۔ آپ کے شاگردوں نے نہ صرف اعتقادی اور نظریاتی پختگی حاصل کی بلکہ
محبت رسول اور عشق مصطفیٰ کی نورانیت سے اپنے سینوں کو منور کرتے رہے۔

آپ لاہور کے ارائیں خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لاہور شہر کے اندر جہاں
ان دنوں اکبری منڈی ہے، آپ کا اپنا مکان تھا۔ نولکھا کے مواضعات میں زمین تھی۔
دریا کے کنارے پر بہت سے کنویں تھے۔ آپ نے ابتدائی دور میں پیشہ ''حلوہ سازی''
اختیار کیا۔ علم دین حاصل کیا۔ آپ کے دوسرے بھائی (مہر قادر بخش) کھیتوں میں
سبزیاں اگاتے، شہر لاتے اور بیچتے۔ آپ حلوہ بناتے، لوگوں کو کھلاتے۔ کھلاتے کھلاتے
اللہ اور رسول کی باتیں سناتے۔ عام لوگوں میں بیٹھ کر مسائل دین ذہن نشین کرتے۔
مخلوق خدا مانوس ہوتی۔ حلوہ خورانی اور شیریں بیانی، دونوں شکم و قلب کو مطمئن کرنے
والی چیزیں تھیں۔ پیٹ کی بھوک اور دل کی بے چینی کا علاج تھا۔

ع نگاہ کے تیر سے گر بچ گیا شکار کوئی — تو بڑھ کے زلف نے اس کو اسیر دام کیا

آپ کی دکان سے حلوہ کھانے والے اور ساتھ ساتھ محبت رسول میں ڈوبی ہوئی

باتیں سننے والے آج تک حضرت حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے انداز گفتگو کو یاد کرتے ہیں۔
دکان سے جو بچتا، گھر کے مختصر اخراجات میں کام آتا یا کتابوں کی اشاعت میں
صرف ہو جاتا۔ پھر آپ نے اپنے حصہ کی زمین اور باغات بیچ کر اللہ کا گھر بنا لیا۔ ایک
وقت آیا کہ مکان بیچ کر تفسیر نبوی کی اشاعت میں روپیہ لگا دیا اور تفسیر پنجاب کے
دیہات اور قصبوں میں بانٹ دی۔ زمین بیچی، اللہ کا گھر بنا لیا۔ مکان بیچا، اللہ کا کلام
چھپوایا اور تقسیم کر دیا۔

ع یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے

آج کوئی ایسی مثال ڈھونڈیں لاہور کے زمینداروں میں، آرائیوں میں، عالموں
میں، پیروں میں، حتیٰ کہ عصر حاضر کے فقیروں میں۔ میں اس زمانے میں بھی حضرت
کی مجالس میں رہا، ان حالات کا عینی شاہد رہا۔ ان محافل کا خاموش مبصر رہا۔ میں نے
علماء کرام کو آپ کے پاس آتے دیکھا اور حضرت کے سامنے علمی مباحث میں مصروف
پایا۔ مشائخ کو دیکھا تو حضرت کو ان کی پابوسی پر مفتخر پایا۔ نعت خوانوں کو دیکھا تو آپ
کی مجالس کو مجلس ذکر سے بھرپور پایا۔ وظیفہ دل کے متوالوں کو آپ کے حلقہ درود پاک
میں محو پایا۔ شب بیدار مسجد کے در و دیوار کو زندہ رکھتے اور واعظان خوش بیان مسجد کے
محراب و منبر کو آباد رکھتے۔

آپ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک کی کثرت سے، قلب و جگر میں جو کیفیتیں
پائیں، آپ کے خامۂ محبت نے پنجابی شعروں کی زبان میں بیان کر دیں۔ قرآن و
احادیث سے استدلال کیا کہ حضور کی بارگاہ میں درود پیش کرنا ہی ایمان کی جان ہے۔
درود کے متعلق احکام شرعیہ کی وضاحت کی۔ درود پاک کے فضائل بیان کیے۔ درود
پاک کے آداب بیان کیے، پھر اہل ایمان کے دلوں پر درود پاک کے جو تاثرات
مرتب ہوتے، جو کیفیتیں قلب و جگر کی زینت بنتیں، انہیں لطیف حکایات میں بیان

کیا۔آپ نے اپنے آقا و مولا کی نعت وثنا میں ڈوب کر اپنے قارئین کو دعوت مطالعہ دی ہے۔بعض مقامات پر تو مولف علام، پنجابی ادب کے موتی رولتے جاتے ہیں اور پھولوں کی لڑیاں دربار مصطفیٰ میں نچھاور کرتے جاتے ہیں۔

نبی کریم کی کائنات ارضی پر آمد آمد ہے۔میلاد مصطفیٰ کے انتظار میں آپ زمین کے گوشے گوشے اور ذرے ذرے کو چشم براہ پاتے ہیں اور پھر پنجابی زبان میں کیا منظر کشی کرتے ہیں:

کھل گئے در فلک دے خوشی ملائک کردے
ہشت بہشت سنگار کیتو نے بھاگوں خیر بشر دے

بدل چڑھے بہار فصل دے وسے مینھ کرم دے
گرد غبار زمین دی بیٹھی وقت گئے پھر غم دے

جھاڑو دے کے باد صبا نے دور کیتے ککھ کنڈے
فراش فضل دے فرش وچھائے مخمل سبز سوہندے

باغ بہار شگوفے ڈالیاں خوش رنگ نکلے سارے
سوہے، ساوے، سبز، سنہری، پھل دیون چمکارے

سن کے عید بہار درختاں سبز پوشاک لگائی
سرو اتے ہُو ہُو دی بنسری قمری آن وجائی

رکھے تاج درختاں سر تے وچھیا تخت پھلاں دا
کر کے صفاں کھلے رکھ تکدے سارے راہ سجن دا

انگوراں سر سجدے تے ویلاں سیس نوائے
شاخاں میویدار درختاں سبھناں ادب کمائے

باد نسیم معطر ہو کے گلاں پھلاں وچ آئی
ہووے مبارک آگھر گھر ہن گزریاں وقت جدائی

تارے جھک آئے ول دھرتی تے وسدے او گھنارے
چن سورج سائبان بنایا، موتی جڑ کے تارے

یہ جذبات، عشق و محبت کے بغیر بیان نہیں کیے جاسکتے۔یہ مسرت دلی عقیدت کے بغیر سامنے نہیں آسکتی۔یہ انداز وجدان محبت کے بغیر اپنایا ہی نہیں جاسکتا۔

(''جہانِ رضا'' جنوری ۲۰۰۵ء)

علماء کرام کی لطیف یادیں

مولانا قیوم الٰہی عرفانی (م:۱۹۹۱-۱۲-۲۹):

اپنے دوست تھے، عالم تھے، فاضل تھے، ذہین تھے، فطین تھے۔ جب گفتگو کرتے تو دانشور معلوم ہوتے۔ بات بڑی پختہ کرتے۔ ایک زمانہ میں وہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کی شاہی مسجد لاہور کے خطیب تھے۔ ان کی وساطت سے ہمیں بھی شاہی مسجد میں آنے جانے کا موقع ملتا۔ بادشاہی مسجد کے در و دیوار ہمیں اپنی گود میں لے لیتے اور اس کے محراب و منبر ہمیں اہلسنت کے ان خطیبوں کی یاد دلاتے جو اورنگ زیب کی زندگی سے لے کر مولانا قیوم الٰہی عرفانی کی خطابت تک محراب و منبر کی زینت بنتے رہے تھے۔ مولانا قیوم الٰہی عرفانی اگرچہ تقریر اور خطاب میں اتنے معروف نہیں تھے مگر مولانا غلام مرشد جب اپنے شاگرد بھگوان مسعود کھدر پوش، ''چیف آف اوقاف'' کے ہاتھوں برخاست کیے گئے تو مولانا عبدالرحمٰن جامی کی چند روزہ خطابت کے بعد ہمارے دوست مولانا عرفانی صاحب خطیب شہر بن کر بادشاہی مسجد کی مسند ارشاد پر جلوہ فرما ہوئے۔

مولانا قیوم الٰہی عرفانی ہمارے بچپن کے دوست تھے ہم ان کے پاس اکثر آتے جاتے تھے اور پاکستان کی سب سے بڑی مسجد کی رونقیں دیکھتے۔ کبھی مینار پر کھڑے ہو کر سارے لاہور کو پاؤں تلے دیکھتے، کبھی عیدین کے خطبے کے دوران ان لاکھوں نمازیوں کا نظارہ کرتے جنہیں مولانا قیوم الٰہی عرفانی اپنے خطاب سے نوازتے تھے۔ مولانا قیوم الٰہی عرفانی اپنے پیش رو خطباء کی طرح اپنے اڑھائی سالہ دور خطابت میں کوئی دینی علمی یا اعتقادی کارنامہ سرانجام تو نہ دے سکے مگر اللہ کی شان وہ شاہی مسجد کے خطیب رہے۔ ہمیں ان کے پاس آنے جانے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ اگرچہ مولانا

عرفانی اڑھائی سال عالمگیری مسجد کے خطیب رہے۔ مگر اس دوران سنی علماء کرام نے شاہی مسجد کی خطابت کے لیے بڑی درخواستیں دیں۔ بعض حضرات نے تو ان کے خلاف شکایات بھی جمع کروائیں۔ وہ اس صورت حال کو دیکھ کر بڑے پریشان تھے وہ ہمارے پاس آتے تو علماء کا شکوہ کرتے اور اپنے برادران یوسف کا گلہ کرتے دوسری طرف اوقاف کے افسران بھی انہیں ڈراتے دھمکاتے رہتے وہ وظائف اور اوراد کو اپنے معمولات زندگی کا حصہ جانتے تھے وہ ان وظائف کو پڑھ کر وقت گزارتے، ہم نے بھی ان کی دفتری پریشانیوں کو دور کرنے کے لیے ایک وظیفہ بتایا اور افسروں کو رام کرنے کا ایک ورد انہیں سکھا دیا اور ہدایت کی کہ جب وہ جابر افسروں کے پاس جائیں تو یہ ورد پڑھ لیا کریں، مگر تسبیح الٹی پھیرا کریں۔

ایک دن دوڑے دوڑے آئے اور کہنے لگے۔ فاروقی صاحب! آج مجھے ''چیف آف اوقاف مسعود بھگوان کھدر پوش'' نے بلایا تھا۔ میرے سامنے ایک فائل رکھ دی جس میں چالیس درخواستیں شاہی مسجد کی خطابت کے لیے آئی تھیں ان درخواستوں میں میرے کئی اپنے دوستوں کے نام بھی تھے۔ میں کانپ اٹھا مگر ورد پڑھتا گیا تسبیح الٹی پھیرتا گیا چند لمحوں بعد بھگوان گرجا ''عرفانی صاحب! پروانہ کریں ان میں سے ایک مولوی بھی شاہی مسجد کی خطابت کے لائق نہیں تم ڈٹے رہو'' یہ واقعہ سنا کر عرفانی صاحب بے پناہ ہنسے اور کہنے لگے آپ کی الٹی تسبیح کا نتیجہ ہے ورنہ میں آج مارا گیا تھا ہم یہ واقعہ اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ محکمہ اوقاف کی مساجد خصوصاً شاہی مسجد اور داتا گنج بخش کی خطابت کرنا کتنا دشوار کام ہے۔ یہاں کے خطیبوں کو بچ بچ کر چلنا پڑتا ہے لوگ ہاتھ تو چومتے ہیں مگر خطیب تلوار کی دھار پر چلتے ہیں۔

مولانا قیوم الٰہی عرفانی ہر سال حج پر جایا کرتے تھے ایک سال جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا کہ جس نے پہلے حج کر لیا ہے وہ حج پر نہیں جائے گا۔ مولانا عرفانی صاحب نے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر اجازت نہ ملی۔ حتیٰ کہ وہ اسلام آباد جا پہنچے اور

جنرل ضیاء الحق سے ملے اور حج کے لیے گزارش کی مگر ان کی گزارش کو سختی سے مسترد کر دیا
گیا۔ عرفانی صاحب ہانپتے کانپتے، افتاں وخیزاں گرتے پڑتے لاہور آئے۔ ہمارے
پاس پہنچے، دریدہ دل کے ٹکڑے دکھانے لگے، رونے لگے اور جامی کا شعر سنانے لگے:

؎ زمہجوری بر آمد جانِ عالم ترحم یا نبی اللہ ترحم!

ہم نے تسلی دی اور دعا کی اور جواباً جامی کا ایک شعر سنایا:

؎ نہ آخر رحمۃ للعالمینی ''زعرفانی'' چرا فارغ نشینی

چلے گئے، گم ہو گئے۔ کراچی کے ایک تاجر نے انہیں بحری جہاز پر ملازم بنا کر
جدہ پہنچا دیا۔ مکہ پہنچے، مناسک حج ادا کیے۔ میدانِ عرفات میں گئے تو اپنے خیمے میں
بیٹھنے کی بجائے جنرل ضیاء الحق کو سلام کرنے چلے گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے دیکھا تو
خوش ہو کر مرحبا کہا اور کہا آپ کو بھلا کون روک سکتا ہے! واپس آئے مجھے واقعات
سناتے گئے اور دل خوش کرتے گئے۔

؎ اشک سچے ہوں تو کبھی ضائع نہیں جاتے
میری پلکوں سے گرے ان کے قدم تک پہنچے

مولانا عرفانی صاحب بڑے خوش باش عالم دین تھے۔ علمی خاندان سے تعلق
رکھتے تھے۔ ان کے ایک بھائی مولانا وجیہ السماء عرفانی سلسلہ چشتیہ قدوسیہ کے پیر
طریقت تھے۔ ان کے ایک اور بھائی ملیک الرحمن داتا صاحب کی مسجد میں ''کشف
المحجوب'' کا درس دیتے اور مسجد شمس عقب مال روڈ میں خطابت فرماتے تھے۔ ان کے
ایک اور بھائی مولانا عزیز اللہ دینہ ضلع جہلم میں بے مثال خطیب تھے۔ آپ کے چچا
انوار الٰہی دار العلوم نعمانیہ لاہور میں ایک عرصہ تک شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔
شاہی مسجد کی خطابت سیاسی علماء اور ملک کے سیاسی لیڈروں کے رحم و کرم پر ہوتی
ہے۔ جو سیاستدان اقتدار کی اونچی کرسی پر بیٹھتا ہے اپنی مرضی کے عالم دین کو شاہی
مسجد کی خطابت دیتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے میں ''خطبہ بنام شہنشاہِ والا جاہ'' نہیں دیا

جاتا۔ مگر وقت کا ہر حکمران یہ چاہتا ہے کہ اس کی بداعمالیوں کا تذکرہ شاہی مسجد کے
محراب و منبر پر نہ ہو۔
شاہی مسجد لاہور کے اڑھائی سالہ دور خطابت کے بعد مولانا عرفانی جامع مسجد
حضرت شاہ جمال لاہور کے خطیب بن گئے اور تاحیات وہاں خطیب رہے۔ ہم مولانا
قیوم الٰہی عرفانی کی علمی و اعتقادی خدمات پر روشنی تو نہیں ڈال سکے مگر ہمیں اللہ کی
فیاضی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ وہ کس طرح گمنام گاؤں کے گمنام بچے کو اٹھا کر شہنشاہ
اورنگ زیب عالمگیر کی شاہی مسجد لاہور کا خطیب بنا دیتا ہے۔ وہ جب ذرے کو آفتاب
بناتا ہے تو آفتاب و ماہتاب منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

مولانا احمد دین درگاہی رحمۃ اللہ علیہ:

پاکستان بن رہا تھا۔ ہم ان دنوں ہارون آباد بہاولنگر (ریاست بہاولپور) کے
ایک مدرسہ تعلیم الاسلام میں فارسی ادب کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ نواب آف
بہاولپور نے ہارون آباد میں ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کروائی۔ اس مسجد کے خطیب
لبیب حضرت مولانا احمد دین درگاہی تھے مولانا درگاہی دار العلوم حزب الاحناف لاہور
کے فاضل تھے اور علامہ ابوالبرکات سید احمد قادری رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی شاگردوں میں
سے تھے۔ خطابت میں شہرۂ آفاق تھے اور تدریس میں مانے ہوئے مدرس تھے۔ آپ
نے ہارون آباد کی اس مسجد کی خطابت کے دوران اسے تعلیم و تدریس کا مرکز بنا دیا۔
ایک دار العلوم قائم کیا۔ حفظ و ناظرہ کے شعبے قائم کیے۔ درسِ نظامی میں طلبہ کی تعلیم کا
نظام قائم کیا۔ اعلیٰ مدرس مقرر کیے اور اس طرح ہارون آباد کو دینی علوم کا گہوارہ بنا دیا۔
مولانا درگاہی اعتقادی اور نظریاتی طور پر بڑے ہی حساس تھے۔ انہوں نے اس بڑی
مسجد کو اعتقادیات کی تربیت گاہ بنا دیا۔ جلسے ہوتے تو ملک کے نامور خطیب آتے۔
جلوس نکلتے تو سارا ہارون آباد صف بستہ ہو جاتا۔ جشن عید میلاد النبی، شب معراج اور
دوسری دینی تقریبات کی رونقیں دوبالا ہو جاتیں۔ مولانا درگاہی علاقہ کے زمینداروں

اور شہر کے تاجروں کو دینی کاموں میں تعاون کرنے کی ترغیب دیتے۔ وہ مسجد کے محراب و منبر میں باجبہ و دستار بیٹھتے۔ تدریس کی مسند پر باوقار استاد کی حیثیت سے براجمان ہوتے۔ درس کے اساتذہ اور شاگردوں پر مشفقانہ نگاہ رکھتے تھے۔

ہم طالب علم کے حیثیت سے ''خوشہ چیدیم ہر جائے کہ خرمن یافتیم'' مولانا کی مجلس میں آتے جاتے تھے۔ مولانا درگاہی بھی شفقت فرماتے اور اپنی مجالس میں خصوصی جگہ دیتے۔ اپنے جلسوں میں مدعو کرتے اور اپنے جلوسوں میں جھنڈا اٹھا کر چلنے کا حکم دیتے۔ مولانا ریاست بہاولپور میں ہر تحریک کے علمبردار ہوتے تھے۔ عوامی جلوسوں کی قیادت کرتے جلسوں کا اہتمام کرتے اور اس وقت کے جید علماء کرام کو بلاتے بلند پایہ خطیبوں کو دعوت خطاب دیتے۔ اس طرح ہارون آباد مرکز دعوت ارشاد بن گیا۔ ہم نے اسی زمانے میں مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا عبد الغفور ہزاروی، ابو النور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، مولانا غلام دین انجمن شیڈ لاہور، مولانا غلام قادر اشرفی لالہ موسیٰ، صاحبزادہ پیر فیض الحسن آلومہاروی، مولانا محمد یار فریدی، استاذ العلماء مولانا ابو البرکات سید احمد قادری اور حضرت محدث اعظم کچھوچھوی کو ہارون آباد کے جلسوں میں تقریر کرتے سنا۔ ہمیں یاد ہے کہ پاکستان بن گیا۔ پاکستان میں پہلی بار تحریک ختم نبوت چلی تو ہارون آباد میں بھی احتجاجی جلوس نکالا گیا اس جلوس کی قیادت مولانا درگاہی فرما رہے تھے۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ آنسو گیس سے نوازا۔ لوگ بھاگنے لگے۔ مگر درگاہی صاحب بازار کے عین درمیان تن تنہا جھنڈا اٹھائے کھڑے رہے اور پولیس کو للکارتے رہے ہم نے یہ منظر دیکھا تو مولانا کی شجاعت کو ہدیہ تحسین پیش کیا۔

مولانا درگاہی کھاریاں (گجرات) کے قریب ایک گاؤں بیگا مروج پور کے رہنے والے تھے۔ شادی کا وقت آیا تو اپنے احباب علماء کرام کو بارات میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ہمیں یاد ہے کہ آپ کی بارات کے جلوس میں مولانا غلام دین انجمن شیڈ لاہور، مولانا غلام قادر اشرفی، خطیب لالہ موسیٰ، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا غلام

جہانیاں، ابو النور مولانا محمد بشیر کوٹلی لوہاراں، قاری احمد حسن فیروز پوری (خطیب گجرات) مفتی احمد یار خان نعیمی، محمد اعظم چشتی اور محمد یوسف نعت خوان جیسے بلند پایہ حضرات موجود تھے۔ ان علماء کرام کے علاوہ آپ کے مقامی احباب شاگردوں اور رشتے داروں کی خاصی تعداد بارات کی زینت تھی۔ یہ ایک انوکھی بارات تھی۔ دولہا کو گھوڑے پر سوار کرانے کی بجائے ایک سجی سجائی بیل گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ لاؤڈ سپیکر رکھا گیا۔ نعت خوان لاؤڈ سپیکر پر درود و سلام اور نعت کے دل نواز نغموں سے فضا کو معمور کر رہے تھے۔ جب دلہن کے گاؤں کی گلیوں میں یہ بارات درود و سلام اور حمد و نعت کے ترانوں سے بجی گونجتی پہنچی تو مستورات نے کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر استقبال کیا۔ پھول برسائے اور حیرت سے کہتی رہیں کہ یہ بارات ہے یا عید میلاد النبی کا جلوس۔ گاؤں کے لوگ صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہوئے پھول نچھاور کرتے تھے۔ مولانا غلام قادر اشرفی دولہا (مولانا احمد دین درگاہی) کے بے تکلف دوست تھے دلہن کے دروازے پر بارات پہنچی تو مولانا غلام قادر اشرفی نے اعلان کیا، حضرات! اب دولہا میاں مولانا احمد دین درگاہی خصوصی خطاب فرمائیں گے۔ مولانا درگاہی اٹھے۔ لاؤڈ سپیکر کے سامنے آئے نہ جھجک نہ ندامت، نہ انکار نہ فرار، دلہن کے گھر کے سامنے آدھ گھنٹہ تقریر کی۔ پھر مجلس نکاح میں بیٹھے آپ کا نکاح پڑھایا گیا، تو سارا مجمع مبارکباد کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

میری زندگی میں اس عالم دین کی یہ عجیب و غریب بارات تھی۔ جہاں دولہا خود دلہن کے دروازے کے سامنے لاؤڈ سپیکر پر تقریر کر رہا ہو اور نکاح کی مجلس میں درجنوں جید علماء کرام جلوہ فرما ہوں۔ دوسرے روز دعوت ولیمہ تھی۔ ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا۔ علماء کرام نے پرزور تقریریں کیں۔ قاریوں اور نعت خوانوں نے اپنی خوش آوازی سے پنڈال کو گرما دیا۔ ہمیں یاد ہے کہ علماء کرام کی اس محفل میں ہم سب سے کم عمر مقرر تھے جو پانچ منٹ کے لیے تقریر کے لیے اٹھے۔ قصبوں اور دیہات سے بیشمار لوگ آئے تھے دیر تک جلسہ رہا سب کو کھانا کھلایا گیا۔ مولانا احمد دین درگاہی مرحوم کی

شادی ہمیں آج تک یاد ہے۔ یہ علمی بات نہ سہی مگر شادی کی بات ضرور ہے! ہے کوئی آج مرد علم و فضل جو اپنی شادی پر تقریر کر کے دلہن کی سہیلیوں سے داد وصول کرے!!

پیر عبدالخالق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ:

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ (مؤلف تفسیر نبوی پنجابی) کے خاص مرید اور خلیفہ تھے انہوں نے ساری زندگی ایک سالک کی حیثیت سے اپنے پیر و مرشد کے زیر سایہ گزاری تیس سال تک سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ میں زیر تربیت رہے عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے۔ شب بیداری میں اپنی مثال آپ تھے۔ اپنے پیر و مرشد کے درویشوں کی خدمت کرتے۔ کسی کو بیٹا بنا لیتے۔ کسی کو چھوٹا بھائی کسی کو درویش، کسی کو فقیر، اسی بہانے سے وہ طالب علموں کی خدمت کرتے رہتے۔ حضرت مولانا نبی بخش حلوائی نے اپنی کئی تصانیف انہیں کے زیر اہتمام شائع کی تھیں۔ پھر ان کا ذکر جا بجا اپنی کتابوں میں کیا ان کی خدمات کا اعتراف کیا۔

پیر عبدالخالق فاروقی زندگی بھر اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں رہے، مگر اپنی زبان پر ان کا نام کبھی نہیں لائے۔ صرف ''حضرت صاحب'' ہی کہتے تھے۔ ایک دن ان کے پیر و مرشد نے ایک امیر آدمی کے پاس کچھ چیزیں لینے کے لیے بھیجا، تو جا کر کہنے لگے کہ ''حضرت صاحب'' نے بھیجا ہے تو پوچھا کہ کون حضرت صاحب تو کہنے لگے، نام تو مجھے یاد نہیں وہ میرے ''حضرت صاحب'' ہیں۔ امیر آدمی بگڑ گیا۔ کہنے لگا جاؤ یہاں کئی حضرت صاحب پھرتے ہیں واپس ہوتے ہوئے کہنے لگے تو میرے حضرت صاحب کو نہیں جانتا تو پھر کس کو جانتا ہے؟ واپس آئے امیر آدمی کے نوکر نے کہا یہ بابا عبدالخالق ہے مولانا محمد نبی بخش حلوائی کا درویش ہے وہ اٹھا۔ پیچھے دوڑا۔ معافی مانگی، گلے لگایا اور حکم بجا لایا۔

حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی، پیر عبدالخالق کی روحانی تربیت پر خصوصی توجہ فرماتے تھے۔ ایک دن پیر عبدالخالق فاروقی کی نماز تہجد قضا ہو گئی۔ مولانا نے فرمایا عبدالخالق تم نے نماز تہجد قضا کی ہے، تم ''ایک ہفتہ تک ہمارے ساتھ چائے نہیں پی

سکتے''۔ پیر عبدالخالق فاروقی اگرچہ ایک درویش، سالک طریقت اور عابد شب زندہ دار تھے۔ مگر اعتقادی طور پر اتنے بیدار دل تھے کہ مسجد نبویہ میں عبادات، دینی تقریبات اور سنی روایات پر عمل درآمد کرتے اور لوگوں سے کرواتے۔ ان کے پیر و مرشد حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ مولانا غلام قادر بھیروی کے شاگرد تھے۔ وہ بڑے راسخ العقیدہ تھے۔ وہ عقیدے کو عبادت و ریاضت پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کی مسجد میں اگر کوئی بدعقیدہ یا گستاخ رسول آجاتا تو مسجد کو دھلواتے۔ مولانا محمد نبی بخش حلوائی ایک طرف نقشبندی سلسلہ کے پیر طریقت تھے دوسری طرف وہ ایک شاعر، مصنف اور مفسر قرآن تھے مگر پیر عبدالخالق فاروقی نے سلوک نقشبندیہ کی نہ صرف تربیت حاصل کی بلکہ سلسلہ نقشبندیہ کی ان روایات کی نگرانی کی جو ان کے پیر و مرشد کی مسجد میں ہوتی تھیں۔ وہ علی الصبح پانچ ہزار بار درود شریف پڑھانے کا اہتمام کرتے۔ تلاوت قرآن میں مصروف افراد کو سہولتیں بہم پہنچاتے۔ عصر کی نماز کے بعد ختم خواجگان میں شرکت کرنے والوں کی نگرانی کرتے۔ کوئی حقہ نوش، سگریٹ نوش یا نامانوس لباس کے ساتھ ختم خواجگان میں شرکت نہ کر سکتا تھا۔ ''گیارہویں شریف'' کے ماہانہ ختم کے انتظامات کی نگرانی کرتے طالب علموں کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ یہ سارے انتظامات کرتے وقت وہ غیر متعلق دکھائی دیتے۔ بعض اوقات نمازیوں کے آنے جانے کا خیال رکھتے۔ بدعقیدہ لوگوں کو مسجد میں آنے سے روکتے۔ تاکہ ان کی وجہ سے مسجد کا امن اور روحانی فضاء متاثر نہ ہو۔

ہم پیر عبدالخالق فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ عالم نہ تھے، خطیب نہ تھے، واعظ نہ تھے، مدرس نہ تھے، استاد نہ تھے مگر آج ہم اپنی مساجد، مدارس کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسے خاموش خدمت گزار یاد آتے ہیں۔ آج ہماری مسجدوں میں ہر شخص کی نگاہیں دوسروں کی جیبوں پر اٹکی ہوئی نظر آتی ہیں۔

(''جہانِ رضا'' مئی، جون ۲۰۰۶ء)

یادِ یارِ مہربان آید ہمی!

پروفیسر علامہ محمد حسین آسی نوراللہ مرقدۂ:

پروفیسر علامہ محمد حسین آسی نوراللہ مرقدۂ اپنے یار مہربان تھے، قدر دان تھے، کبھی کبھی وہ ہمارے دل کے قریب ہو کر ہماری پہچان بن جاتے تھے۔ وہ صاحب علم تھے، صاحب قلم تھے، صاحب دل تھے، وہ ایک عرصہ سے جسمانی عوارض میں مبتلا رہے۔ مگر ان عوارض کے باوجود اُن کا قلم رواں تھا۔ ان کی زباں گوہر فشاں تھی اور ان کی زیارت ہمارے لیے تسکینِ جان تھی۔

وہ ایک روحانی سفر پر نکلے تو ۱۸ اگست ۲۰۰۶ء کو داعی اجل نے دورانِ سفر ہی پیغام وصال دیا اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ہم نے انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھ کر دل پر ہاتھ رکھا۔ مگر ان کا چہرہ نقشِ لاثانی بن کر بار بار ہمارے سامنے آتا رہا، اور ہمیں تڑپاتا رہا۔

ع اِک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے!

علامہ پروفیسر محمد حسین آسی ایک استاد تھے، معلم تھے، مدرس تھے، مقرر تھے، اور دینی مجلسوں کی جان تھے، آج سے بیس سال قبل پہلی بار وہ ہمارے پاس آئے پروفیسر مگر درویش سیرت، درویشانہ لباس اور شیریں زبان، مولانا محمد بخش صاحب نقشبندی اور مولانا بشیر احمد نقشبندی آپ کے ساتھ تھے۔ ان دنوں آپ اپنے پیرومرشد کے روحانی احوال پر کتاب ''انوار لاثانی'' ترتیب دے رہے تھے۔ اگرچہ ہم نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کا مطالعہ کیا ہوا تھا مگر پروفیسر محمد حسین آسی اسے نئے انداز میں ترتیب دے رہے تھے، اور خانوادۂ عالیہ نقشبندیہ لاثانیہ کی روحانی خدمات کو سامنے لانا چاہتے

تھے، انہیں ''انوارِ لاثانی'' کا نام بڑا پسند تھا۔ یہ حضرت پیر طریقت سید جماعت شاہ لاثانی علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات پر لکھی گئی تھی۔ حضرت آسی صاحب کے قلم نے اسے نیا رنگ دیا۔ اپنے پیرومرشد نقشِ لاثانی سید علی حسین شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ صاحبزادہ پیر سید عابد حسین شاہ علی پوری اور صاحبزادہ پیر سید محمد اسمٰعیل شاہ المعروف کا کا جی علی پوری کی نگرانی میں ترتیب دے رہے تھے۔ پروفیسر محمد حسین آسی نے ہماری تحریروں کو پڑھا تھا۔ پسند کیا تھا۔ محبت کی نظر سے دیکھا تھا، لاہور تشریف لائے اور فرمانے لگے ''انوارِ لاثانی کے نئے ایڈیشن کا ''مقدمہ'' آپ لکھیں گے''۔ ہمارے لیے اتنے اعلیٰ روحانی خانوادہ کی علمی اور روحانی خدمات پر قلم اٹھانا بڑا مشکل تھا۔ مگر انہوں نے اصرار کیا کہ مقدمہ تو آپ ہی لکھیں گے: انہوں نے ہماری مدد فرمائی، حوصلہ دیا، قلم پکڑا، راہنمائی فرمائی اور آمادہ کر لیا کہ یہ سعادت آپ ہی کا حصہ بنے گا۔ ہم نے مقدمہ لکھا تحریر کی نوک پلک خود پروفیسر صاحب نے سنواری اور اس طرح انوار لاثانی کے نئے ایڈیشن کے ابتدائی صفحات پر ہمارا نام آ گیا۔

ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

اس ابتدائی ملاقات کے بعد پروفیسر محمد حسین آسی نے ہمیں اپنے دامنِ محبت سے کبھی جدا نہ ہونے دیا جب لاہور آتے ملاقات سے نوازتے، وہ آتے تو ہم دامن دل بچھا دیتے۔ ہم ان کی تحریروں کو پڑھتے تو داد دیتے۔ ان کے اندازِ بیاں کی تعریف کرتے اور ان کی علمی اور روحانی خدمات پر اظہارِ مسرت کرتے۔ اگرچہ ان کا روحانی سلسلہ اپنے پیرومرشد سے اتنا مربوط تھا۔ اور اپنے پیرومرشد کی نگرانی میں روحانی تربیت پانے میں بے پناہ مصروف رہتے تھے۔ مگر ہمارے ساتھ ان کا علمی، تحریری اور پھر محبت کا رشتہ قائم رہا۔ دائم رہا، اور دمِ آخر تک رہا۔

جب ان کی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر آتیں تو ہم ایک سرسری نظر سے دیکھتے تو انہیں ہدیۂ تحسین پیش کرتے۔ ہمیں یاد ہے کہ انہوں نے جب اپنے کالج

کی طرف سے ''قرآن نمبر'' ترتیب دیا اور اسے خوبصورت انداز میں شائع کیا پھر اسے علمی حلقوں میں تقسیم کیا تو سارے ملک میں تہلکہ مچ گیا کہ شکر گڑھ کے ایک کالج کا میگزین قرآن کا پیغام لے کر آیا ہے۔ آپ نے اس نمبر کو ترتیب دینے میں بڑی محنت کی۔ عمدہ مضامین شریک اشاعت کیے۔ قرآنی مفہومات، قرآنی نکات اور قرآنی مطالب اس انداز سے پیش کیے کہ جو شخص پڑھتا قرآن فہمی میں سے اپنا حصہ لیتا۔ ہم اس نمبر پر تبصرہ تو نہ لکھ سکے مگر فاضل مرتب کو ہدیۂ تحسین پیش کیا۔ دل کھول کر گفتگو کی جس سے آپ بڑے خوش ہوئے یہی قرآن نمبر بعد میں ایک خوبصورت کتاب کی شکل میں چھپا۔

آگے چل کر آپ کا شاہوار قلم رواں دواں ہوا۔ کئی کتابیں سامنے آئیں۔ اور نہایت عمدہ کتابیں آئیں، لوگوں نے پسند کیں، بعض کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اہلِ محبت کے دلوں کی کھیتیوں کو سیراب کرتے گئے۔

ہم اس تحریر میں آپ کے علمی اور روحانی کمالات کا ذکر نہیں کر رہے صرف ان کا ذکر...... یادِ یارِ مہربان آید ہمی...... کے عنوان سے کر رہے ہیں ورنہ ان کی علمی خدمات، ان کی روحانی منازل، ان کا روحانی خانوادہ سے تعلق، فنافی الشیخ کی منازل اور اپنے شیخ پر سب کچھ قربان کر دینے کے اعزازات پر روشنی ڈالتے۔ ہمیں تو ان کی مجالس...... ان کی تحریریں...... ان کی لاہور میں آمد اور صرف ملاقاتوں تک کا تذکرہ کرنا ہے۔

علامہ پروفیسر محمد حسین آسی نے جب ماہنامہ ''الحقیقہ'' جاری کیا۔ اگرچہ یہ ماہنامہ پاکستان کے ایک غیر معروف قصبہ شکر گڑھ سے جاری ہوا تھا۔ مگر فاضل مدیر اعلیٰ کی تحریروں کی وجہ سے سارے پاکستان کے علمی حلقوں میں دھوم مچ گئی۔ ماہنامہ الحقیقہ کے کالم بڑے فکر آموز، ان میں آسی صاحب کے قلم کی جولانیاں دیدنی ہوتیں۔ آپ کے اندازِ بیاں پر داد دینے کو جی چاہتا۔ وہ خوب لکھتے تھے وہ دشمنانِ اسلام پر رضا کے تیر کا وار بے بن کر جھپٹتے وہ بے دین اور علمی دانشوروں کے خیالات کی دھجیاں اڑاتے نظر آتے۔ وہ بدعقیدہ بتوں پر کاری ضربیں لگاتے وہ اپنے ہم مسلک علماء کی

بے اعتدالیوں پر بھی زبردست محاکمہ کرتے۔ تعاقب کرتے بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا کہ ان کے قلم کی مار اعداء کے سینے سے پار ہو رہی ہے۔ آپ کا قلم جس موضوع پر اٹھتا بڑا شگفتہ ہوتا بڑا ادیبانہ جملوں سے آراستہ ہوتا اور جا بجا جب اساتذہ کے اشعار کے نگینے اپنی تحریروں میں جڑتے تو دل جھوم اٹھتا۔ ان کی تحریر روایتی ملا کی خشکی سے آلودہ نہیں تھی۔ ان کے دلائل فلسفیوں کی یبوست سے دور تھے۔ وہ لکھتے تو کلیاں شگفتہ ہو جاتیں۔ ان کے اداریے پڑھنے کے قابل ہوتے، پڑھتے پڑھتے لطف آجاتا۔ ہم نے کئی بار دیکھا کہ ان کے اداریے اقتدار کے قلعوں پر برق و باران بن کر ٹوٹتے۔ وہ قوم و ملک کے غاصب حکمرانوں کو للکارتے۔ ان کے مظالم پر زبردست تنقید کرتے۔ ان کے مظالم پر برملا آواز اٹھاتے، انہیں عبرتناک انجام سے آگاہ کرتے۔ ان کی آخرت کی عبرتناک تصویر کا نقشہ کھینچ دیتے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حفاظت میں رکھا۔ کوئی جابر ان کی طرف نہ بڑھ سکا۔ کوئی ظالمانہ نگاہ ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ دے سکی۔ ہمیں پوری طرح اندازہ نہیں مگر جب ہم ان کے تربیت یافتہ نوجوانوں کو آپ کے ساتھ دیکھتے تو دل خوش ہو جاتا۔ جب وہ اپنے ''شیرانِ اسلام'' کا ذکر کرتے تو بہت خوشی ہوتی۔ وہ ہمیں اپنی مساجد، مدارس اور تربیت گاہوں کی تفصیلات بتاتے تو ہماری خوشیوں میں اضافہ کرتے۔ وہ اپنے مستقبل کے منصوبوں پر گفتگو کرتے تو ہمیں حوصلہ ہوتا۔ ہم کبھی کبھی ان کی ان کوششوں پر لکھنے پر آمادہ ہوتے مگر رک جاتے۔ مگر جب ہم ان کی خدمات کو ہدیۂ تحسین پیش کرتے تو وہ خوش ہو جاتے۔

ہمیں یاد ہے کہ آج سے چند سال پہلے انہیں کئی بیماریوں نے بیک وقت گھیر لیا۔ وہ ڈاکٹروں کے مشوروں پر ہسپتال میں ''پابند آرام'' ہو گئے کئی ہفتے زیرِ علاج رہے۔ ڈاکٹروں کی زیرِ نگرانی رہے۔ مگر اس دوران رات کی تنہائیوں میں اٹھ بیٹھتے۔ پہلے نوافل ادا کرتے پھر ڈاکٹروں کے نگرانوں سے آنکھ بچا کر اتنی زبردست تحریریں صفحہ قرطاس پر لے آتے جس سے ''الحقیقہ'' کا ایک ضخیم نمبر تیار ہو گیا، جب چھپا تو دھوم مچ گئی۔ ہم نے پڑھا تو ان کی بیماری کے دوران ان کے ''بیمار قلم'' کی روانی کی داد دی۔

ایک خط لکھا اور تجویز کی حضور اب آپ بیمار بن کر ہسپتال میں ہی رہا کریں اور ایسی تحریریں لایا کریں۔ تاکہ ہم تندرست قارئین آپ کے لیے دعائیں کرتے رہیں۔

حضرت علامہ پروفیسر محمد حسین آسی ہمارے دوست تھے۔ خانوادہ علی پور سیداں شریف سے روحانی نسبت رکھتے تھے اور عقیدہ کے لحاظ سے راسخ العقیدہ سنی عالمِ دین۔ مولانا امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے اعتقادی مسلک پر ثابت قدمی سے زندگی گزارتے رہے۔ انہوں نے امام احمد رضا کے افکار و تعلیمات کے پھیلانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ مرکزی مجلسِ رضا کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔ اسی مجلس کے زیرِ اہتمام جب ہم نے ماہنامہ ''جہانِ رضا'' جاری کیا اور افکارِ رضا کے مختلف انداز پر تحریریں پڑھیں۔ تو بے حد خوش ہوئے خود چل کر لاہور تشریف لائے۔ حوصلہ دیا۔ داد و تحسین دی۔ اور ہماری مسلکی کوششوں اور اداریاتی تحریروں کو ہدیہِ تحسین پیش کیا۔ وہ دم آخر تک ''جہانِ رضا'' کے کالموں کا مطالعہ کرتے اور ہمیشہ داد دیتے رہے ورنہ علمائے کرام کے خانوادے کے بزرگ کسی کی حوصلہ افزائی میں اپنے ''روایتی بخل'' کا سہارا لے کر اپنی بلند علمی پر فخر کرتے رہتے ہیں۔ پیرانِ عظام کا ایک طبقہ اعلیٰ حضرت سے دور رہتا ہے اور اپنی ''روحانی بدعات'' کو چھپانے کے لیے اعلیٰ حضرت کی تعلیمات سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے مگر پروفیسر محمد حسین آسی رحمۃ اللہ علیہ روحانی سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے زبردست سالک ہونے کے باوجود امام احمد رضا کو اپنا مسلکی رہنما مانتے تھے پھر سنی عالمِ دین ہونے کے باوجود اعلیٰ حضرت کے مسلک کو اجاگر کرنے والوں کا احترام کرتے تھے اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ انہوں نے ہزاروں بار ''جہانِ رضا'' کی خدمت کو سراہا اور بتایا کہ افکارِ رضا کی ترجمانی کرنے والا واحد رسالہ ہے جسے ہر سنی کے گھر پہنچنا چاہیے۔

(الحقیقہ، حضور مفکر اسلام نمبر شکر گڑھ، ستمبر ۲۰۰۶ء)

خطیبِ پاکستان مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۹۸۴ء)

''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی گئی تو اس کے بانی حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم نے ۱۹۶۹ء سے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہر سال عرس منانا شروع کیا اور اس سالانہ عرس کا نام ''یومِ رضا'' رکھا۔ حکیم صاحب مساجد، مدارس اور خانقاہوں سے نکل کر ''یومِ رضا'' کا جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال، موچی دروازہ، لاہور میں کیا کرتے تھے۔ یہ پہلا یومِ رضا تھا جب مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کے خطاب کا اعلان ہوا۔ مولانا اوکاڑوی ایک خوش نوا نعت خوان تھے مگر کراچی میں جا کر انہوں نے ایک شیریں بیان خطیب کی حیثیت سے نام پیدا کیا۔ آستانہ عالیہ شرق پور شریف سے روحانی تعلق کی بنا پر حضرت شیرِ ربانی کے عرس پر حاضر ہوتے تو سارے پنجاب کے اہلِ محبت کو اپنی خوش بیانی سے مسحور کر دیتے۔ مرکزی مجلسِ رضا کی خدمات کو دیکھا تو بانیِ مرکزی مجلسِ رضا کی دعوت پر یومِ رضا پر تشریف لا کر اعلیٰ حضرت پر ایسی شاندار تقریر کی کہ ہر شخص جھوم جھوم اٹھا۔ اور برکت علی ہال اہلِ شوق سے لبالب ہو گیا۔

ع بلبلِ باغِ مدینہ تیرا کہنا کیا ہے!

ہمیں اسی ''یومِ رضا'' پر خطیب پاکستان سے نیازمندی کا شرف حاصل ہوا۔ پھر جب وہ لاہور تشریف لاتے تو شرفِ زیارت بخشتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب آپ نے عام جلسوں میں اپنی خطابت کے جوہر لٹانے کے ساتھ ساتھ اپنی قلم کے آبدار موتی بکھیرنے شروع کیے۔ غالباً انہیں احساس تھا کہ زبان و کلام کی خوش بیانی اپنی جگہ مگر تحریر اور قلم کی روانی کے اثرات دُور دُور تک جاتے ہیں۔ انہوں نے نماز پر کتاب لکھی، نعتیہ انتخاب ''نغمۂ محبوب'' مرتب کیا، ثواب العبادات لکھی، راہِ توحید لکھی، ''انگوٹھے

چومنے کا ثبوت"، لکھی، "راہِ عقیدت"، لکھی۔ یہ ساری کتابیں مدینہ پبلشنگ کراچی سے چھپنے لگیں۔ مجھے یاد ہے کہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے "یومِ رضا" پر "نغمۂ محبوب" کے پانچ سو نسخے منگوا کر اپنے احباب میں تقسیم کیے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کی تحریر آسان مگر مدلل ہوتی ہے، تھوڑے الفاظ میں اہلِ سُنّت و جماعت کے اعتقادی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے حل کر جاتے ہیں۔ اور جو مسائل بڑی بڑی کتابوں میں تلاش کرنے سے حل ہوتے ہیں وہ ثواب العبادات، راہِ توحید جیسی کتابوں میں مستند دلائل کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ پھر آپ نے "نماز مترجم" لکھی تو مجھے اس کے ناشر نے بتایا کہ اس کتاب کے بیس لاکھ نسخے ملک اور ملک سے باہر تقسیم ہو چکے ہیں اب تو اس کا انگریزی ترجمہ بھی چھپ گیا ہے۔

مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم و فکر نے اپنا سفر جاری رکھا اور ذکر الحبیب، ذکر الحسین، شامِ کربلا، امام پاک اور یزید پلید جیسی بلند پایہ کتابیں سامنے آئیں۔ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کی روح کو خدا خوش رکھے وہ جب لاہور آتے، شرقپور شریف جاتے یا قومی اسمبلی کے اجلاسوں میں براستہ لاہور جاتے تو مرکزی مجلسِ رضا کے دفتر سے ہو کر جاتے اور زیارت سے مشرف فرماتے تھے۔ ہم نے ان کی کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر وہ خطابت کے بادشاہ تھے۔ وہ "خطیبِ پاکستان" تھے۔ جہاں جاتے اہلِ محبت کے دل و دماغ میں اپنی تقریروں کی خوشبوؤں کو پھیلاتے جاتے۔ وہ تقریر کے دوران نعت پڑھتے۔ خصوصاً اعلیٰ حضرت کی نعت پڑھتے تو لوگ پکار اُٹھتے:

ع بلبلِ باغِ مدینہ تیرا کہنا کیا ہے!

۲۰/ اپریل ۱۹۸۴ھ کو آخری خطاب اپنی بنائی ہوئی جامع مسجد گلزارِ حبیب، کراچی میں کیا۔ اسی شب دل کا دورہ پڑا اور ۲۴ اپریل کو صبح ۵۵ برس کی عمر میں اذان فجر کے بعد درود و سلام پڑھتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور اگلے روز اپنی جامع مسجد گلزارِ حبیب کے ایک گوشہ میں آسودہ خاک ہوئے۔

"رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دائماً ابداً"

سے آپ کا سنہ وصال ۱۴۰۴ھ مستخرج ہوتا ہے۔

ان کی وفات کے بعد خطابت کا ایک باب ختم ہو گیا مگر ان کے جواں سال بیٹے علامہ کوکب نورانی نے اپنے والد مکرم کی روایت کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ فروغ بخشا۔ انہوں نے اپنے والد کے نام کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ نام کو روشن کر دیا۔ تحریر و تقریر میں اپنا لوہا منوایا۔ اور جہاں گئے اہلِ علم و فضل سے داد وصول کرتے گئے۔ دُنیا کے مختلف ممالک میں گئے اور اپنی خطابت کے جوہر دکھائے اور اپنے والد خطیبِ پاکستان مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے صدقۂ جاریہ بنتے رہے۔ اُنہوں نے اپنے والدِ گرامی کی طرح "مرکزی مجلسِ رضا" سے نہ صرف رابطہ رکھا بلکہ اُس کی سرپرستی کی اور "جہانِ رضا" کو اپنی نوازشات اور رشحاتِ قلم سے نوازا۔

ع کوکب نورانی را احمد شفیع

(غیر مطبوعہ)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے منے مجلسی

چنیوٹ کے مضافات میں جانگلیوں کا ایک گاؤں ہے جس کا نام ''مونیانوالہ'' ہے۔اس گاؤں کا ایک نوجوان پیر سید میر احمد شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہے۔وہ عیدالاضحیٰ کے بعد مرکزی مجلس رضا کی محفل میں ''ننھا منا مجلسی'' بن کر آ پہنچا۔اور فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسائل اور تصانیف پر گفتگو کرنے لگا۔ہم اس کی باتوں کو سنتے گئے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔اس نوجوان نے اپنے مرشد سید میر احمد شاہ بخاری کی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ سے مسلکی وابستگی اور عقیدت کی باتیں سنائیں تو حضرت سید میر احمد شاہ کی یاد نسیم جان بن کر غم خانہ دل میں آ پہنچی۔

نسیم خُلد می وزد، مگرز جوئے بارہا
کہ بوئے مشک می دہد ہوائے لالہ زارہا

سید میر احمد شاہ بخاری جلال پور جٹاں (گجرات) کے خانوادہ سادات کے گل سرسبد تھے۔وہ واعظ باکمال پیر سید ظہور شاہ بخاری کے چچا زاد بھائی تھے۔بڑے فاضل بڑے عالم اور بڑے درددل کے مالک تھے۔جوانی متحدہ ہندوستان بمبئی میں گزاری۔اور پاکستان بننے کے بعد گجرات چلے آئے جہاں سے چنیوٹ کے گاؤں میں بسنے والے مریدوں نے آپ کو ''مونیانوالہ'' میں لا بسایا۔پھر آپ نے ساری زندگی وہاں گزار دی۔

سید میر احمد شاہ بخاری مرکزی مجلس رضا لاہور سے وابستہ تھے۔آج سے تیس سال قبل بانی مرکزی مجلس رضا حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی مجالس میں آنے لگے۔اور ہر سال یوم رضا کے موقع پر حاضری دیتے ایک دن اعلیٰ حضرت کا ایک رسالہ

الاستمداد علی اجیال الارتداد (۱۳۳۷ھ) لے آئے۔اس رسالے کے حاشیہ پر اعلیٰ حضرت کے دستخط تھے۔غالباً وہ اعلیٰ حضرت نے کسی شاگرد کو عطا فرمایا تھا۔پیر سید میر احمد شاہ فرمانے لگے آپ اس پر حواشی لکھیں۔

اللہ اللہ کس قدر خوش فہمیاں!

یہ رسالہ وہابیہ دیوبندیہ کے دو سو تیس اقوال کے رد میں تھا۔جو اردو زبان میں تین سو ساٹھ اشعار پر مشتمل تھا۔ہماری علمی اور اعتقادی استعداد سے بہت بلند موضوع تھا۔اس پر حواشی لکھنا ہمارے بس کی بات نہ تھی معذرت کر دی۔پھر اصرار ہوا۔مزید اصرار ہوا تو ''ذکر احباب ودعاء احباب'' پر مفصل حواشی لکھے اور ایک مکمل کتاب بن گئی۔حضرت میر احمد شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے زیور طباعت سے آراستہ کیا اور پاک و ہند کے اہلِ علم وفضل میں تقسیم کیا۔یہی ایڈیشن چند سال ہوئے بریلی شریف (انڈیا) سے چھپا۔

مولانا محمد منشاء تابش صاحب آج سے تیس سال پہلے دیارِ حبیب میں گئے۔تو وہاں مولانا ارشد القادری مدظلہ العالی سے ملاقات ہوئی جن کے پاس ''زلزلہ'' کا ایک مطبوعہ نسخہ تھا۔تابش صاحب کے لیے یہ ایک نئی چیز تھی۔مدینہ پاک میں بیٹھے بیٹھے ساری کتاب نقل کر لی۔جب واپس آئے تو چھپنے کے لیے سارا مسودہ عنایت فرمایا۔ہم نے کتابت کرالی تھی کہ پیر سید میر احمد شاہ مرحوم کی نگاہ اشتیاق نے دیکھ کر اصرار کیا کہ ''زلزلہ'' میرے اہتمام میں چھپے گا۔چنانچہ پاکستان میں ''زلزلہ'' کا پہلا ایڈیشن پیر صاحب کے زیر اہتمام ''مکتبہ مظہر فیض رضا برج منڈی فیصل آباد'' سے چھپا۔

پیر صاحب اعلیٰ حضرت کی کتابوں کے عاشق تھے۔کوئی رسالہ آتا تو ساری رات پڑھنے میں گزار دیتے۔اعلیٰ حضرت کے ایک مخلص مرید کے بیٹے فیاض کاوش وارثی مرحوم سندھ میں گورنمنٹ شاہ عبداللطیف بھٹائی کالج میرپور خاص میں پروفیسر آ لگے تو انہوں نے ایک کتاب ''پیرانِ پیر'' تالیف کی۔حضرت پیر صاحب بذات خود

پیر پر حاس جا پہنچے مسودہ حاصل کیا اور ۱۹۷۷ء میں اپنے اہتمام میں ''مکتبۂ مظہر فیضِ رضا برج منڈی فیصل آباد'' سے چھپوا دیا۔ حضرت پیر صاحب کتابی ذوق کے میدان میں امام اہلِ سنت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کے گرویدہ تھے۔ وہ خود نقشبندی مجددی تھے خانوادۂ چورہ شریف سے نسبت روحانی رکھتے تھے مگر محدث قادری بریلوی کے فدائی تھے۔ سید میر احمد شاہ بخاری کا یہ مرید صادق پیر صاحب کے مزار کے فیضان کی باتیں کر رہا تھا۔ ان کی کرامات کا ذکر کر رہا تھا۔ ان کے بیٹے اور سجادہ نشین سید مظہر حسین شاہ ولی کی شفقتوں اور محبتوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ ہم اس کے چہرہ کے اتار چڑھاؤ کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے کہ ''مرکزی مجلس رضا'' کے یہ ننھے منے مجلسی کہاں کہاں سے چل کر ہمارے پاس چلے آتے ہیں۔ اور ان یادوں کو تازہ کرتے رہتے ہیں جو ہماری خوشیوں کا اثاثہ ہیں۔

گونج گونج اٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستان!

حاجیوں کے قافلے واپس آنے شروع ہوتے ہی ہمارا ایک عزیز ----- دیارِ حبیب سے واپس آیا تو سیدھا مرکزی مجلسِ رضا کی مجلس میں آ بیٹھا۔ ہم ابھی استقبال کے لیے اٹھے ہی تھے اپنے بازو پھیلائے ہی تھے اور لبوں پر اھلاً وسھلاً آیا ہی تھا کہ اس عزیز محترم نے اپنا ''خریطہ حج'' کھولا۔ اور ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ یہ ہے آپ کا آبِ زم زم یہ ہیں آپ کی کھجوریں یہ ہیں برنی اور یہ ہیں عجوہ یہ ہیں آپ کے لیے عطر کی رنگا رنگ شیشیاں۔ یہ ہے تسبیح یہ ہے مصلی، یہ ہیں گھڑیاں، یہ ہیں سنہری لڑیاں، یہ ہے ٹوپی یہ ہے رومال اس کو رکھنا بڑا سنبھال! اب اس عزیز نے ان مدنی احباب کے نام لینے شروع کر دیئے جنہوں نے یہ تحفے بھیجے تھے ہمارا دل جھوم جھوم رہا تھا۔

مدینے کی خوشبو مدینے کے تحفے — لیے جا رہا ہوں جیے جا رہا ہوں
سلامٌ علیکَ، علیکَ السّلاما — کہے جا رہا ہوں جیے جا رہا ہوں

بتانے لگا۔ آپ کے دوست مرکزی مجلس رضا کے پہلے صدر فضیلت الشیخ حکیم محمد عارف صاحب ضیائی مدنی ان دنوں نجدیوں کی جیل میں ہیں۔ ان کا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ وہ تعویذات لکھتے تھے۔ دم درود کرتے تھے۔ ان کے گھر سے پانچ ہزار دانوں کی تسبیح اور ''شمع شبستانِ رضا'' برآمد ہوئی تو نجدیوں نے آپ کو ''ساحر'' کہہ کر پانچ سال کے لیے پس دیوار زنداں کر دیا۔ حکیم محمد عارف صاحب ضیائی ہمارے بڑے پیارے دوست ہیں وہ گزشتہ تیس سال سے دیارِ حبیب میں مقیم ہیں۔ رمضان المبارک میں بارگاہِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک سو زائرینِ حرم کی افطاری کراتے ہیں اپنے گھر میں پاکستان اور ہندوستان کے علمائے اہلِ سنّت کی دعوت کرتے ہیں۔ آج سے تیس سال پہلے وہ مرکزی مجلسِ رضا کے صدر تھے۔ بانیوں میں سے تھے۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری کے رفیق کار تھے۔ مرکزی مجلسِ رضا کی بنیادوں کو مضبوط بنانے والے لوگوں میں سے تھے۔ مدینہ پاک گئے تو انہیں فاضل بریلوی کے خلیفہ خاص مولانا ضیاء الدین مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت ملی کئی سال زیرِ تربیت رہے۔ بیعت ہوئے اپنے پیر و مرشد کے فرزند مولانا فضل الرحمٰن مدنی کی مجالس میں رہے۔ وہ حکیم ہیں، طبیب ہیں اور اعلیٰ حضرت کی کئی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرا کے عرب ممالک میں تقسیم کر چکے ہیں۔ وہ قادری سلسلہ طریقت کے پیروکار ہونے کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے عاشق ہیں سید: غوث اعظم پر کئی عربی کتابیں چھپوا کر تقسیم کر چکے ہیں۔ ''دلائل الخیرات'' کے کئی ایڈیشن عرب کے اہلِ محبت اور افریقی ممالک کے زاہدوں، عابدوں کو ہدیہ کر چکے ہیں۔ ہمیں ان کی اس ابتلاء پر بڑا ملال ہے۔ ان کی رہائی کیلئے لبوں پر بار بار دعائیہ جملے آئے۔ مگر

کسی کو دشت نوردی کسی کو دار و رسن
یہ عظمتیں ہیں مقدر کسی کسی کے لیے!

عزیزم نعیم عزیز صاحب ایم اے سیاسیات کے طالب ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی

میں زیرِ تعلیم ہیں وہ فاضل بریلوی کی کتابوں اوران کی علمی خدمات سے ناآشنا ہیں مگر مان نہ مان میں تیرا مہمان بن کر مرکزی مجلسِ رضا کی مجالس میں چلے آتے ہیں۔ایک دن آئے تو علماء کرام تشریف فرما تھے اساتذہ گفتگو کر رہے ہیں۔رضوی حضرات علمی نکتے بیان کر رہے ہیں۔مگر نعیم عزیز صاحب بلا جھجک چلے آئے۔چند لمحات خاموشی سے سنتے رہے پھر حسبِ عادت گویا ہوئے:

نئے زمانے میں آپ ہم کو پرانی باتیں سنا رہے ہیں!

سوادِ اعظم لٹ گیا اہلِ سُنّت بکھر گئے!سنی لٹ گئے!حنفی مر گئے!بریلوی ختم ہو گئے!مگر آپ لوگ ابھی تک بریلی کے ''محلہ سوداگران'' میں بیٹھے ''الوظیفۃ الکریمہ'' کا ورد کر رہے ہیں ہمارا دل آیا کہ نعیم عزیز کو بیک بنی و دو گوش پکڑ کر باہر نکال دیں مگر وہ کہے جا رہے تھے۔سنیوں کی دینی اور سیاسی قوت پارہ پارہ ہوگئی۔جمعیت العلماء پاکستان کے ٹکڑے ہو گئے۔جمعیت العلماء پاکستان (نورانی) جمعیت العلماء پاکستان (نیازی) جمعیت العلماء پاکستان (نفاذِ شریعت گروپ) جمعیت العلماء پاکستان (سوادِ اعظم گروپ) جمعیت العلماء پاکستان (مرکزی) جمعیت العلماء پاکستان (سوادِ اعظم)

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

ہم نے اسے سمجھایا کہ ہم سنی ہیں سوادِ اعظم ہیں عزیزِ محترم جنہیں تم ٹکڑے ٹکڑے کہتے ہو وہ تو ''گلہائے رنگارنگ'' ہیں جو رونقِ چمن ہوتے ہیں۔

وہ بولے یہ رونقِ چمن ہیں یا آندھیاں غم کی یوں چلیں باغ اجڑ کے رہ گیا!

ہم نے انہیں دوبارہ سمجھایا کہ ہم لوگ اندر سے ایک ہیں۔ایک ہی منزل ہے۔ ایک ہی قبلہ ہے ایک ہی مسلک ہے ایک ہی عقیدہ ہے۔کہنے لگے فاروقی صاحب!یہ ایک نہیں ہیں۔''جماعت اہلِ سُنّت'' کے کئی ٹکڑے ہیں۔پہلے صرف ایک ''جماعت اہلِ سُنّت'' تھی اب ''مرکزی جماعت اہلِ سُنّت'' بھی آ گئی جماعت اہلِ سُنّت (کراچی) جماعت اہلِ سُنّت (ملتانی) جماعت اہلِ سُنّت (لاہوری) کیا یہ بھی

گلہائے رنگارنگ ہیں؟ کیا یہ بھی رونقِ چمن ہیں؟ کیا یہ بھی بہارِ وطن ہیں؟ مجلس میں بیٹھے ایک عالمِ دین نے نعیم عزیز کو بتایا کہ ہمارے سنیوں کے سارے گروپ ایک سٹیج پر متفق ہیں۔مسلک اعلیٰ حضرت پر مسلکِ رضا پر، مسلک اہلِ سُنّت پر، اس میں کسی گروپ کسی جماعت کا کوئی اختلاف نہیں۔یہی وجہ ہے کہ ہم مسلکِ رضا کو نقطۂ اتحاد اہلِ سُنّت جانتے ہیں۔نعیم عزیز، چونکہ سیاسیات کا طالب علم ہے وہ مسلک رضا کی برکات کی گہرائیوں تک نہیں جا سکتا۔کہنے لگا: ہاں ہاں! یہ لوگ مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام'' کی دلنواز آواز پر متفق ہیں اور اسی آواز پر روٹیاں توڑتے ہیں اگر ان کے پاس یہ شعر بھی نہ ہوتا تو ان انتشار زدہ لوگوں کو روٹی بھی کوئی نہ پوچھتا! مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک اور عالمِ دین نے نعیم کو سمجھایا کہ برخوردار۔تم اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا نعتیہ دیوان ''حدائقِ بخشش'' پڑھا کرو۔تمہاری سیاسی سوچ بدل جائے گی۔اس موقع پر ایک خوش آواز مجلسی نے اعلیٰ حضرت کی کہی ہوئی نعت:

وہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں

سنا کر محفل کا رنگ بدل دیا۔اب نعیم عزیز کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اور ہم جھوم رہے تھے۔

(''جہانِ رضا'' مارچ ۲۰۰۲ء)

مرکزی مجلس رضا کے ننھے منے مجلسی

ہمارے ایک ملاقاتی ہیں۔ جو پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم ہیں۔ وہ اکثر ہمارے پاس آجاتے ہیں۔ ''جہانِ رضا'' خریدتے نہیں مگر پڑھتے ضرور ہیں۔ سطر سطر پڑھتے ہیں اور ایک ایک حرف کو نگاہ تنقید سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک سال سے ہمارے پیچھے پڑے ہیں کہ ''جہانِ رضا'' کے صفحات پر اعلیٰ حضرت عظیم البرکت رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر خیر تو ہوتا ہے۔ اور آپ بڑے بڑے علماءِ اہلِ سُنّت کے تذکرے اور مشائخ کرام کے حالات لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن کبھی ہم جیسے لوگوں کا ذکر تک نہیں کیا۔ وہ ''ہم جیسے لوگوں'' کے ذکر پر اتنا اصرار کرتے رہتے ہیں۔ جیسے وہ ''رومی و جامی'' کے ہم عصر ہوں۔ ایک دن وہ روزنامہ جنگ، روزنامہ نوائے وقت اور پھر کراچی کا خوبصورت ''اخبار جہاں'' اٹھائے لائے۔ اور کہنے لگے کہ آپ کا ''جہانِ رضا'' ان سے بڑا نہیں۔ ان میں دیکھیں عالمی اذکار وافکار کے ساتھ ساتھ چھوٹی سے چھوٹی چیز کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ دیکھیے اتنے بڑے بڑے اخبارات کے صفحات بھنڈی توری، آلو کچالو، کدو کریلوں، کے تذکروں کے علاوہ موٹے موٹے عطائی حکیموں کے اشتہارات اور ان کے فوٹو پھر فلمی پریوں کی تصاویر سے پر ہوتے ہیں۔

ہم نے اس طالب علم کی باتوں کو درخور اعتناء نہیں جانا تھا مگر ''آج ہم نے توڑ دیا کاسۂ غرور!'' کہہ کر اپنے ننھے منے ملاقاتی کی بات مان لی اور مرکزی مجلسِ رضا میں آنے والوں کے اذکار سے اپنی محفل سجانے کا فیصلہ کر لیا۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ اپنا ہے رات ان کی

ہمارا سارا دن ''مرکزی مجلسِ رضا'' کے اشاعتی کاموں میں گزر جاتا ہے۔ گھر آتے ہیں تو ٹیلیفون کی گھنٹیاں تنگ کرتی ہیں۔ نصف شب لکھتے لکھاتے گزر جاتی ہے اور باقی رات شبِ ہجراں بن کر کٹتی ہے۔

کسی کی شب وصل سوتے کٹے ہے — کسی کی شب ہجر روتے کٹے ہے
ہماری بھی شب کیسی شب ہے الٰہی — نہ روتے کٹے ہے نہ سوتے کٹے ہے!

دن باتوں میں گزر جاتے ہیں راتیں سونے میں گزر جاتی ہیں۔ مگر نہ ہمیں وصال کی لذتیں اور نہ ہجر کی عظمتیں میسر آتی ہیں۔

لو ابھی کالم لکھنے بیٹھے ہی تھے کہ ہمارے ایک ننھے منے ملاقاتی آپہنچے یہ ہارون آباد سے آئے ہیں ''جہانِ رضا'' کو پڑھتے ہی نہیں یاد کرتے جاتے ہیں۔ یہ کالج کے طالب علم ہیں۔ نام طارق ہے۔ ''جہانِ رضا'' نہ ملے تو بے تابی سے انتظار کرتے ہیں اور شکایت کے خط لکھتے ہیں۔ ابھی ان کی خیریت نہیں پوچھی تھی کہ عزیزم حافظ محمد شاہد اقبال آ پہنچے۔ ہمارے سامنے ایک عرصہ تک یہ طالب علم رہے ہیں۔ ہم انہیں ''برخوردار'' کہا کرتے تھے ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے تھے تو انہیں ''شیریں گفتار'' بھی کہنے لگے۔ انہوں نے بھاٹی دروازے کے اندر ایک قدیم مسجد کی تعمیر نو کروائی اور اسے درخشاں کر دیا۔ مسجد کا نام ''مسجد صدیق اکبر'' رکھا۔ اس میں ایک خوبصورت لائبریری قائم کی۔ ایک حلقہ تدریس قائم کیا۔ اذان، نماز، صلوٰۃ وسلام کا اہتمام کیا۔ سالانہ مجالس منعقد کر کے ملک کے نامور خطیبوں کو دعوت خطاب دینے لگے۔ جلسے کا اشتہار چھاپتے تو اعلیٰ قسم کے خطاطوں سے قلم مستعار لیتے۔ ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر اپنے طور پر کئی کتابیں شائع کر کے مفت تقسیم کیں۔ اعلیٰ حضرت عظیم البرکت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد ملک العلماء مولانا الشاہ محمد ظفر الدین رضوی بہاری کی معراجیہ موضوع پر تقاریر بعنوان ''بیان المعراج'' کئی جزوں میں تیار کر کے مفت تقسیم کی۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد پروفیسر مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ (انڈیا) نے اپنے نایاب مسودات موصوف کو دیئے جنہوں نے زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے ان سے داد و تحسین حاصل کی۔ مگر اب وہ ''برخوردار شیریں گفتار'' نہیں رہے بلکہ لاہور کی ایک مشہور دینی درسگاہ میں استاد ہیں۔ درجنوں طالب علم ان کی مسند کے سامنے صف بستہ بیٹھتے ہیں اور انہیں ''حضرت جی! حضرت جی'' کہتے ہیں اب ہم انہیں کس طرح ''برخوردار'' کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہمارے پاس بیٹھے ہوئے بھی دارالعلوم نعمانیہ اور دارالعلوم نظامیہ کی دستار فضیلت سجائے بیٹھتے ہیں۔ ابھی ہم نے حافظ محمد شاہد اقبال صاحب کو چائے کی پیشکش نہیں کی تھی۔ کہ ڈاکیا آ گیا تازہ ڈاک لے آیا۔ دیکھتے دیکھتے درِ خیابان کھل گیا۔

سب سے پہلے خوبصورت لفافہ کھلا تو اس میں سید صابر حسین شاہ بخاری، برہان شریف، اٹک کا خط مسکراتا مسکراتا سامنے آ گیا۔ بخاری صاحب قبلہ تذکار رضا پر خوب لکھتے ہیں کبھی کبھی ان کے ''نفاست نامے'' ماہنامہ جہانِ رضا کے صفحات پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ قارئینِ جہانِ رضا پڑھتے ہیں تو خوش کام ہو جاتے ہیں۔ وہ عالم ہیں، معلم ہیں، محقق ہیں اور تذکرہ نویس ہیں۔ خوب لکھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ اس برقیاتی چکا چوند دور میں اپنے دور افتادہ گاؤں (برہان) میں ''چراغ شب'' کی روشنی میں ''جہانِ رضا'' اور دوسری کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ سنا ہے انہوں نے دو بکریاں پال رکھی ہیں۔ جن کا دودھ پی کر دل و دماغ کو کھانے پینے کی ملاوٹ کے اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ بوعلی سینا اپنے دماغ کی نفاست کی ایک وجہ ''بکری کا دودھ'' بیان کیا کرتے ہیں۔ سید صابر حسین شاہ بخاری نے اپنے گاؤں (برہان شریف) میں ''ادارہ فروغ افکارِ رضا'' قائم کیا ہوا ہے۔ جہاں آفتاب بریلی کی کرنیں ضیاء باریاں کرتی رہتی ہیں۔

ڈاک کھولی تو ایک اور خوبصورت لفافہ سامنے آیا اتنا خوبصورت کہ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا تو ''دستہ گل چیں کی جھنک'' کا احساس بیدار ہو گیا۔ اس میں ہمارے عزیز

محترم علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی کا جگمگاتا ہوا ''محبت نامہ'' برآمد ہوا۔ اگر ہم اسے ''عنبر شامہ'' کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ''اگر نوازش نامہ'' لکھیں تو مبالغہ نہ ہوگا اگر اسے ''کوکب نامہ'' کہہ کر ''نفاست نامہ'' بنا کر ''جہانِ رضا'' کے نفاست ناموں میں شائع کر دیں تو قارئین جہانِ رضا خوش ہو جائیں گے۔ علامہ کوکب نورانی حضرت مولانا محمد شفیع اوکاڑوی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزندِ ارجمند ہیں۔ ادیب ہیں، خطیب ہیں اور پھر ہمارے حبیب لبیب ہیں...... ''اے تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم'' ہم ان کا خط پڑھ کر ایسے خوش ہو جاتے ہیں جیسے دنیا و جہاں کے لوگ ان کی ورلڈ ٹی وی پر گفتگو سن کر خوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے انبوہ میں ''جہانِ رضا'' پڑھنے میں کوتاہی نہیں کرتے اور ہماری حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔

ابھی یہ خوشبودار خط پڑھ کر رکھا ہی تھا کہ ایک اور لفافہ سامنے آ گیا۔ یہ ہمارے ایک دوست جو آزاد کشمیر کی ٹھنڈی فضاؤں میں رہتے ہیں۔ کی طرف سے تھا۔ یہ علامہ محمد رفیق مجاہد نقشبندی ناظم اعلیٰ ''بستان نقشبندیہ'' اور نگرانِ اعلیٰ ''گلستانِ رضا'' کڈھالا بھمبر ہیں۔ ان کا کرم نامہ کھلا۔ خط کیا تھا۔ ''در معنی کھلا''۔ اپنی مجاہدانہ تحریر کے ساتھ ساتھ ہماری بہت سی علمی راہنمائی فرما جاتے ہیں۔ مشورے۔ حوصلہ افزا جملے، تنقیدی زاویے۔ اپنی علمی جدوجہد کی داستانیں گرد و پیش کی باتیں۔ اپنے بیگانوں پر اظہار خیال۔ وہ خط لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں ہم ان کی بعض نصیحتوں کو پلے باندھ لیتے ہیں۔ بعض باتوں پر عمل کرتے ہیں۔ اور بہت سی باتوں کو ''گول'' کر جاتے ہیں۔ ابھی ہم مجاہد آف آزاد کشمیر کا خط پڑھنے نہیں پائے تھے کہ ہمارے ایک ننھے منے دوست عزیزم ''محبوب الرسول صاحب قادری'' تشریف لے آئے یہ صاحب ''سوئے حجاز'' لاہور اور سہ ماہی ''انوارِ رضا'' جوہر آباد کے ایڈیٹر ہیں وہ جب تشریف لاتے ہیں ''نسیم جاں فزا کا جھونکا'' تو نہیں ''جھکڑ'' بن کر آتے ہیں ہماری کیا مجال کہ ان کے سامنے ڈاک کو ہاتھ لگا سکیں۔ ڈاک ایک طرف رکھی اور جناب محبوب الرسول

قادری کا ''دفترِ معنی کھلا'' آدھی لاہوری اور آدھی جوہر آبادی زبان (جسے ہم جانگلی زبان کہتے ہیں) میں گفتگو کرتے ہیں۔ بقول ''سودا''...... ''وہ جہاں بیٹھتے ہیں باغ لگا دیتے ہیں!'' باتوں پہ باتیں، خبروں پہ خبریں، دن رات کام کرتے ہیں۔ لاہور کی لمبی سڑکوں اور گلیوں کو پیدل طے کرتے جاتے ہیں ان کے ہاں رات دن میں کوئی تمیز نہیں۔ دور و نزدیک میں کوئی فرق نہیں اندھیرے اجالے میں کوئی ڈر نہیں۔ ''جہانِ رضا'' پڑھتے ہیں بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ چھپنے سے پہلے پڑھنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ''ماہنامہ جہانِ رضا'' کی بعض تحریروں پر تنقید کرتے ہیں بعض اوقات تنقید کرتے کرتے چائے کی پیالی بھی ٹھنڈی کر دیتے ہیں۔ ہمیں ان کی یہ ''کج ادائیاں'' یہ ''راہنمائیاں'' اور یہ ''مہربانیاں'' خوشگوار لگتی ہیں وہ اپنے رسالوں کے صفحات پر بہت کچھ لکھ جاتے ہیں مرنے والوں کا ''ذکرِ خیر'' کر جاتے ہیں۔ جینے والوں کے ''نام نکو'' بتاتے جاتے ہیں۔ لوگ پڑھے لکھے ہوتے ہیں وہ لکھے پڑھے دانشور ہیں۔ ان کا سلسلہ گفتگو ابھی جاری ہی تھا کہ دور دراز سے ایک اور دوست آپہنچے۔

اگرچہ یہ دوست مولوی نہیں مگر کتابیں محبت سے پڑھتے ہیں مطالعہ کے شوقین ہیں سرحد کے قبائلی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کا نام غیر علمی ہے۔ ''سرخاب خاں مقہوری'' میں نے کئی بار ان کے نام پر تنقیدی گفتگو کی۔ مگر وہ بے پناہ دلائل کی روشنی میں مجھے مطمئن کر دیتے ہیں۔ اگرچہ سرخاب کو اپنے پروں کے لحاظ سے دنیا بھر کے پرندوں پر بڑی شہرت ہے۔ مگر میرے موصوف تو ''جہانِ رضا'' کے قاری، اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے عاشق، حکیم محمد موسیٰ امرتسری مرحوم کی خدمات کے معترف، عقائد کے لحاظ سے پکے سنی، سچے رضوی۔ بتا رہے تھے کہ میں افغانستان پر امریکہ کی بمباری کے دوران قندھار چلا گیا تھا۔ کئی طالبان میرے شناسا تھے ان کی خیریت مطلوب تھی ملا عمر (امیر المومنین) میرے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ میں جب لاہور آتا وہ مجھے ''دلائل الخیرات'' اور ''اورادِ فتحیہ'' لانے کی فرمائش ضرور کرتے تھے۔ جناب

سرخاب خاں نے بتایا مجھے ''اسامہ بن لادن'' سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ مگر میں جب عرب مجاہدین سے ملتا تو اُن سے عربی میں گفتگو کرتا تو مزہ آجاتا۔ مجھے ان کی جانبازی، جذبۂ جہاد اور جان نثاری بڑی پسند تھی۔ جن دنوں میں قندھار گیا تھا سارے دوست مختلف کیمپوں اور غاروں میں چلے گئے تھے۔ امریکہ کے بمبار آتے بم گراتے پھر بھاگ جاتے مجھے ان کے بھاگنے کی ادا بڑی پسند تھی۔ سرخاب خاں لوٹے ہوئے افغانستان کی باتیں سناتے گئے تباہ حال افغانیوں کی داستانیں سناتے گئے اور نظامی گنجوی کے ''سکندر نامہ'' کے وہ اشعار سناتے گئے جن میں تاریخی بہادروں کی داستانیں درج ہیں اس طرح وہ مجھے طالب علمی کا زمانہ یاد دلاتے جن دنوں ہم اپنے استادوں سے ''سکندر نامہ'' پڑھا کرتے تھے ابھی ان کے لیے چائے منگوائی ہی تھی کہ ہمارے علمائے کرام کا ایک ریلہ آپہنچا۔ اب کہاں سرخاب خاں اور کہاں سرخاب کے پر، چائے کی پیالی اٹھائی دو گھونٹ بھرے اور ''رجال الغیب'' کی طرح گم ہو گئے۔

(''جہانِ رضا'' فروری ۲۰۰۲ء)

بانی مرکزی مجلس رضا حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا غلام دستگیر قصوری رحمۃ اللہ علیہ میرے استادِ مکرم حضرت مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے استاد بھی تھے اور پیر و مرشد بھی۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب ''تقدیس الوکیل عن توہین الرشید والخلیل'' حضرت علامہ حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کے ذاتی کتب خانہ میں موجود تھی۔ میرے استادِ مکرم مولانا باغ علی صاحب نسیم کی خواہش تھی کہ یہ کتاب از سرِ نو زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر لوگوں کے سامنے آئے۔ میں ان دنوں اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے فارسی کے لیے یونیورسٹی کے جلیل القدر اساتذہ کے زیرِ تربیت خوشہ چینی کر رہا تھا، کتابیں پڑھنے کا شوق، کتابیں تلاش کرنے کا جنون، کتابیں خریدنے کا عشق، کتاب دوست حضرات کو ملنے کی تگ و دو، یہ میری زندگی کے مشاغل کا ایک حصہ تھا۔ ''تقدیس الوکیل'' مرتب کرنے کے لیے آگے بڑھا، اس کی تاریخی اور اعتقادی اہمیت کو سامنے رکھا اور مسودہ کتابت کے لیے دے دیا۔ یہ ایڈیشن صرف اردو تھا، چھپنے سے پہلے ایک بھرپور ابتدائیہ سپردِ قلم کیا جس میں علمائے اہلِ سنّت کی مجالس سے سنی سنائی باتوں کو تحریر بنا کر شریکِ طباعت کر دیا۔ جب کتاب نوری کتب خانہ لاہور سے چھپ کر سامنے آئی تو علمائے اہلِ سنّت نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کتاب کی حیثیت و اہمیت تو پہلے ہی مسلم تھی مگر میرے ابتدائیہ پر جب علماءِ کرام نے خراجِ تحسین پیش کیا تو دل میں آیا کہ

''ہم بھی چمن میں ہیں''

ان دنوں ہمارا ''علمی زاویہ'' دہلی دروازہ لاہور کے باہر مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد کے اس حجرے میں تھا جہاں مولانا محمد نبی بخش حلوائی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی اور

روحانی مجالس کی خوشبو ابھی تک اہلِ علم و فضل کے دل و دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ ایک دن ایک جواں سال صحت مند ہی نہیں بلکہ تنومند شخص ہمارے حجرے میں آیا اور بیٹھنے کے بعد کتاب ''تقدیس الوکیل'' کی بے پناہ تعریف کی، اس کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالی، کتاب کے تاریخی مقامات پر اظہارِ خیال کیا اور سب سے بڑھ کر میرے ابتدائیہ پر ہدیۂ تحسین پیش کیا اور پوچھنے پر بتایا کہ میرا نام محمد موسیٰ امرتسری ہے، رام گلی میں دکان ہے اور کتاب دیکھ کر آیا ہوں، آپ بھی کبھی آنا۔ چند دنوں بعد میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی دکان (مطب) پر جا پہنچا دکان تو مختصر سی تھی مگر وہاں کئی دانشورانِ عصر حکیم صاحب کے ''حلقۂ مریضانِ علم'' میں بیٹھے دکھائی دیئے، مجھے بھی جگہ عطا ہوئی، خصوصی توجہ فرمائی، شربت شیریں کا جام پلایا، خمیرہ گاؤزبان کھلایا اور مجلس میں بیٹھے اہلِ علم حضرات سے تعارف کرایا۔ ان اہلِ علم میں ایک دیوبندی تھا، ایک وہابی حتیٰ کہ ایک مرزائی۔ انا للہ و انا الیہ رجعون۔ میں تو جل بھن کر رہ گیا۔ میرے کانوں میں سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی آواز آئی ''طوطی در پنجرہ زاغاں گرفتار شدہ'' حکیم صاحب کے ساتھ علمی باتیں کرتے، تاریخی باتیں کرتے، تحقیقی باتیں کرتے اور پھر دل ستانی کی باتیں کرتے۔ میں حساس طبیعت کا مالک تھا، نوجواں تھا، طالب علم تھا، پھر سب سے بڑھ کر نیا نیا ''مولوی'' تھا چکرا کے رہ گیا۔ اٹھا، افسردہ خاطر اور شکستہ دل اٹھا اور اجازت لے کر چل دیا۔

کل جو پیرِ مغاں کی محفل سے جو اٹھا مست اٹھا، خراب اٹھا!

ان دنوں مفتی محمد حسین صاحب نعیمی نے انجمن نعمانیہ لاہور سے علیحدہ ہو کر چوک دالگراں کی جامع مسجد میں ''جامعہ نعیمیہ'' کی بنیاد رکھی تھی۔ میں مفتی صاحب کو ملنے جاتا، وہاں علماء اہلِ سنّت کا جمگھٹا ہوتا۔ وہاں سے اٹھتے تو چوک دالگراں میں ہی ''مقبول عام پریس'' میں ایک نشست ہوتی جہاں احراری اور دیوبندی مولویوں کے علاوہ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری، مولانا محمد بخش مسلم، حاجی لق لق، جناب مرتضیٰ احمد میکش ایڈیٹر

نوائے پاکستان اور مالکان مقبول عام پریس کے علاوہ اہلِ دانش کی زیارت ہوتی۔ میرا راستہ رام گلی سے ہوتا ہوا "جامعہ نعیمیہ" کو جاتا تھا مگر میں دانستہ راستہ بدل کر نکل جاتا۔ ایک دن رام گلی سے ہو کر گزرا تو حکیم صاحب کو مطب میں اکیلے بیٹھے دیکھا، رک گیا اور بیٹھ گیا۔ خمیرہ کھایا، شربت پیا اور بلاشرکت غیرے اور بلا سایہ رقیبے حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب سے گفتگو ہوئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ حکیم تو اپنا ہے، ہم مسلک ہے، ہم عقیدہ ہے، ہم نفس ہے، ہمدم ہے اور ہم دل ہے۔ حکیموں کی محفل میں ہر قسم کے "مریض آتے جاتے ہیں" دل مان گیا، غصہ ختم ہوا، تعصب دور ہوا، اب حکیم صاحب کی مجالس میں آنا جانا شروع ہوا تو واقعی حکیم محمد موسیٰ صاحب کو ایک دانشور، ایک محقق، ایک درویش، ایک فقیر اور اہلِ علم و دانش سے محبت کرنے والا شخص پایا۔ ان کی محفل میں بوئے گل بھی تھی، نالہ دل بھی تھا اور دود چراغ محفل بھی تھا۔ بڑے بڑے اہلِ علم و فضل سے ملاقات ہوئی اور اس طرح یہ سلسلہ ایک عرصہ تک ہی نہیں بلکہ زندگی بھر چلتا رہا۔

"رام گلی" میں میرے کئی رفقائے علم بھی رہتے تھے۔ اورینٹل کالج کے استاد مولانا علم الدین سالک صاحب میرے ایم اے فارسی کے ہم سبق، سید اصغر علی شاہ جعفری ایم اے، سید سعید علی شاہ زنجانی اور دوسرے کئی دانشور رہتے تھے۔ میری تلاش میں ان حضرات کا رخ آہستہ آہستہ حکیم صاحب کی مجالس کی طرف ہونے لگا۔ حکیم صاحب کی مجالس میں کئی احباب تو میری وساطت سے آ گئے مگر کئی حضرات حکیم صاحب کی طرف سے میرے قریب ہوتے گئے۔ بشیر حسین ناظم (تمغہ حسن کارکردگی) پروفیسر مخدوم غلام جیلانی پروفیسر اورینٹل کالج، سید اصغر علی شاہ جعفری ایم اے، مولانا باغ علی نسیم، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، میاں محمد دین کلیم مرحوم، سید ریاض حسین شاہ خراباتی، مفتی غلام سرور صاحب لاہوری کے نبیرہ مفتی محمود عالم اور دوسرے کئی حضرات علم و فضل میری وساطت سے حکیم صاحب کے قریب ہوئے، مگر کئی ایسے دانشور سامنے آئے جنہیں حکیم صاحب کی مجالس سے میں نے اپنے قریب کر لیا۔ سید

شرافت نوشاہی (مولف شریف التواریخ) محمد عالم مختار حق (دانشور) سید بشیر حسین طاہری مرحوم، مولانا غلام دستگیر نامی مرحوم، پروفیسر محمد اقبال مجددی، پروفیسر محمد اسلم (شعبہ تاریخ) پروفیسر محمد ایوب قادری کراچی، غرضیکہ ہزاروں اہلِ علم و دانش حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کی مجالس سے اپنے بنے۔

حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری ان دنوں "تذکرہ علمائے امرتسر" پر کام کر رہے تھے۔ ان کے اپنے مضامین اور تبصرے مختلف قلمی ناموں سے "فیض الاسلام راولپنڈی" میں چھپ رہے تھے۔ بعض اہم کتابوں پر ان کے ابتدائیے، مقدمے اور دیباچے اہلِ علم و فضل کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ مجھے حکیم صاحب نے ترغیب دی کہ میں علمائے امرتسر کی طرز پر "تذکرہ علمائے اہلِ سنّت لاہور" مرتب کروں۔ میں کام کرنے لگا، حکیم صاحب نے اس سلسلہ میں نہ صرف میری راہنمائی فرمائی بلکہ بڑی مدد دی۔ علماء کے حالات کے لیے نشاندہی کی، اہلِ علم و فضل کی تحریروں کے تراشے مہیا کیے۔ مختلف علمائے اہلِ سنّت کے احوال و مقامات پر گفتگو کی، حکیم صاحب کا "تذکرہ علمائے امرتسر" تو ان کی تحقیقاتی زنجیروں میں جکڑا رہا مگر ان کی راہنمائی سے "تذکرہ علمائے اہلِ سنّت لاہور" تیار ہو گیا، چھپ گیا، تقسیم ہو گیا، بک گیا، بلکہ کئی ایڈیشن سامنے آ گئے۔

حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب جہاں ایک مجلسی آدمی ہیں وہاں ایک اچھے میزبان بھی ہیں۔ ان کے ارد گرد اہلِ علم کا ایک حلقہ ہر وقت قائم رہتا ہے، یہ بات ان کے ہاں بڑی امتیازی انداز میں پائی جاتی ہے کہ وہ علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ میں ایسے سیکڑوں مشاہیر قلم کو ذاتی طور پر جانتا ہوں جو بعض علمی مسائل کے حل کے لیے حکیم صاحب کے پاس آئے، مگر دوسری طرف وہ ان سکالرز، طالب علم اور محققین کی راہنمائی سے کبھی پہلو تہی نہ کرتے۔ راہنمائی کرتے، امداد کرتے، اطلاع دیتے، کتابوں کے حوالے دیتے، اگر کوئی سکالر کتابیں نہ خرید سکتا تو اپنی محدود آمدنی سے خود کتاب خریدتے اور رجسٹری کرا کے اس کے گھر تک پہنچاتے۔

آج ہمارے ملک میں سیکڑوں ایسے اہلِ قلم موجود ہیں جنہوں نے حکیم صاحب کی اس فیاضی سے حصہ لیا ہے۔

ایک طرف حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کا مطب اہلِ علم وقلم کا مرکز تھا، دوسری طرف خود حکیم صاحب بھی اہلِ علم و دانش کے ہاں چل کر جاتے۔ استفادہ کرتے، مشائخ کے حجروں میں حاضری دیتے۔ اگر کوئی باہر سے صاحبِ علم آتا تو اس کی قیام گاہ پر خود حاضر ہوتے، خوشہ چینی کرتے، استفادہ کرتے، روحانی شخصیتیں حکیم صاحب کی نیازمندانہ حاضریوں کی گواہ ہیں۔

ان دنوں حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب کا معمول تھا کہ نماز جمعہ جامع مسجد حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ پڑھتے۔ مزار مبارک پر حاضر ہوتے، فاتحہ خوانی کرتے، وہاں آئے ہوئے علماء اور صلحاء سے ملاقات کرتے، وہاں آئے ہوئے مشائخ اور صوفیہ کی زیارت کرتے۔ واپسی پر ''نوری کتب خانہ'' سے ہوتے ہوئے مسلم مسجد کے نیچے مولوی شمس الدین مرحوم کی کتابوں کی دکان پر آ بیٹھتے یہ دکان قدیم کتابوں کا بہت اعلیٰ مرکز تھا، پھر اس کے مالک مولوی شمس الدین حکیم صاحب کے مخلص اور خاص دوستوں میں سے تھے۔ حکیم صاحب مولوی شمس الدین کی دکان پر خاصا وقت دیتے، یہاں کتاب دوست دانشور آتے، کتابیں دیکھتے، خریدتے اور نادر و نایاب کتابوں پر گفتگو کرتے۔ حکیم صاحب ایسے کتاب شناس دانشوروں اور علماء سے مختلف کتابوں پر گفتگو کرتے۔ یہ دکان جہاں علماء وفضلاء کا مرکز تھی وہاں نادر و نایاب کتابوں کا ذخیرہ بھی تھی اور مولوی شمس الدین کی وجہ سے اہلِ محبت کی جلوہ گاہ تھی۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب نے اس مرکز پر اپنی آمد و رفت اور نشست و برخاست کو ایک عرصہ تک زندہ رکھا۔ یہاں بیٹھنے والے اہلِ علم آگے چل کر حکیم صاحب کی علمی مجالس کے کرسی نشین بنے۔

ایک وقت آیا کہ حکیم صاحب نے رام گلی میں بڑھتے ہوئے تجارتی اور معاشرتی دباؤ سے تنگ آ کر ''ریلوے روڈ'' پر مطب لے لیا اور ایک پرسکوں اور نئے انداز میں

اہلِ علم وفضل کی محفلیں جمنے لگیں۔ حکیم صاحب کی محفل میں اگرچہ ہر مکتبِ فکر کے دانشور آتے تھے مگر کچھ عرصہ بعد یعنی ۱۹۶۸ء میں حکیم صاحب نے ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی بنیاد رکھی اور امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی اشاعت کا ایک زبردست منصوبہ بنایا۔ اس منصوبہ پر دن رات کام کرنے لگے اور خالصتاً عقائد اہلِ سُنّت پر کتابیں، رسالے، پمفلٹ، مقالے، اشتہارات چھپنے لگے۔ حکیم صاحب کے اس پروگرام پر بعض حضرات ناگواری کے اس احساس میں مبتلا ہوئے اور آہستہ آہستہ وہ ان سے کٹتے گئے، ہٹتے گئے حتیٰ کہ وادی گم گشتگان میں گم ہوتے گئے۔ دوسری طرف ایک ایسا طبقہ ابھر کر سامنے آیا جس نے حکیم صاحب کے مشن کو بڑا پسند کیا اور وہ ان کے دست و بازو بننے لگے۔ اب حکیم صاحب تھے اور خیابانِ رضویت کی آبیاری تھی، حکیم صاحب تھے اور بہارستان رضا کی گل کاری تھی، حکیم صاحب تھے اور دبستانِ رضا کی گل فشانی تھی۔ اس مرد درویش نے چشتی نظامی ہوتے ہوئے بھی برصغیر کے ایک قادری کی تعلیمات کو عام کرنا شروع کیا۔ وہ خود حکیم تھے مولوی نہیں تھے مگر امام اہلِ سُنّت و مجدد مائۃ حاضرہ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی اشاعت کا علم اٹھائے سرگرم ہو گئے۔ آپ ایک دکاندار اور ادویات فروش تھے مگر نظریات رضا کی شیرینی تقسیم کرنے لگے۔ مولانا سعید احمد نقشبندی نے ''مکتوبات امام ربانی'' پر کام شروع کیا تو آپ پوری طرح سے ان کے معاون رہے، جب مکتوبات کا ترجمہ مکمل ہوا تو آپ نے ایک بھرپور مقدمہ لکھا، مولانا ابوالحسنات کا ترجمہ ''کشف المحجوب'' چھپنے لگا تو آپ نے ایک زبردست مقدمہ لکھا، ایسے کئی مقدمات اور دیباچے حکیم صاحب کی علمی اور فکری عظمت کا پتا دیتے ہیں۔

کچھ عرصہ بعد آپ مرکزی مجلسِ رضا کے سٹیج سے چند قدم اور آگے بڑھے۔ اب ''یوم رضا'' منایا جانے لگا۔ یوم رضا کے مقالات چھپ چھپ کر ملک بھر میں تقسیم ہونے لگے۔ ''برکت علی محمڈن ہال'' اور نوری مسجد ریلوے اسٹیشن یوم رضا کی رونقوں سے گونج اٹھے۔ ملک کے نامور علماء کو دعوت خطاب دی جاتی، علمائے کرام سے ہٹ کر

کالجوں کے پروفیسر، یونیورسٹیوں کے دانشور اور عدالتوں کے جج ''یوم رضا'' پر خطاب کرنے لگے۔ یومِ رضا کی روئیدادیں اور مقالات یومِ رضا چھپ کر سارے ملک کے اہلِ علم کے ہاں پہنچتے تو لوگ جھوم جھوم جاتے اور انہیں پڑھنے کے لیے ایک نیا انداز ملتا۔

''مرکزی مجلسِ رضا'' کی آبیاری کے لیے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری نے اپنا خون پسینہ ہی ایک نہیں کیا بلکہ خون جگر تک قربان کر دیا۔ غربت کی ساری عظمتوں کے ساتھ وہ دن رات کام کرتے، وہ بے سروسامانی کو سامان بنا کر کام کرتے، وہ رات کو دن بنا کر کام کرتے، وہ دن کو روشنی بنا کر کام کرتے، ان کے ساتھ نوجوانوں کی ایک مختصر سی ٹیم تھی جو ہر وقت چاق و چوبند آپ کے ساتھ کام کرتی، یہ لوگ رات کو اندھیروں میں ''یومِ رضا'' کے اشتہارات لگاتے اور گلی گلی، کوچے کوچے میں پہنچتے۔ شہر کے اردگرد کے دیہات اور قصبوں میں حکیم صاحب بذاتِ خود اور ان کے نوجوان پیغامِ رضا لے کر جاتے۔

''یومِ رضا'' کی رونقیں دیدنی اور ''یومِ رضا'' کے خطابات شنیدنی ہوتے تھے۔ اہلِ علم و فضل دور دور سے جمع ہوتے اور تقاریر سنتے۔ ادھر حکیم صاحب بذاتِ خود نہ مولوی تھے نہ خطیب، نہ نقیب تھے نہ رقیب، نہ مقرر تھے نہ لیکچرار، نہ صدر نہ سیکرٹری، دروازے پر ایک فقیر بے نوا کی طرح کھڑے ہوتے، علماء کرام کا استقبال کرتے، مہمانوں کو بٹھاتے، حاضرین کا خیال رکھتے، جلسہ گاہ کے انتظام و انصرام کے لیے دوڑے دوڑے پھرتے۔ نوری مسجد میں ''یوم رضا'' کی دھوم مچی ہوتی مگر ''ناظم یوم رضا'' دروازے پر کھڑا نظر آتا۔ علماء گرج رہے ہوتے مگر ''نگران یومِ رضا'' مہمانوں کی پذیرائی میں مصروف ہوتا۔ نعت خوان اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا کلام سناتے مگر حکیم صاحب مجلس رضا میں آنے والے نعت خوانوں کے لیے آنکھیں فرشِ راہ کیے کھڑے ہوتے۔

میں ان دنوں گورنمنٹ کے ایک محکمے میں آفیسر تھا۔ اپنے ساتھ آفیسروں کو لے کر ''یومِ رضا'' کی تقاریب میں پہنچتا، دوسرے دن دفتر میں نشست ہوتی، اپنے افسروں کو اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعریف میں رطب اللسان پاتا تو دل

خوش ہو جاتا۔ رات کو علماء کرام کے حلقہ میں بیٹھتا تو علمائے کرام کو ''یوم رضا'' کی تعریف کرتے پاتا۔ دینی مدارس میں جاتا تو اساتذہ اور طلبہ اعلیٰ حضرت بریلوی پر گفتگو کرتے سنائی دیتے۔ نعت خوانی کی مجالس میں حاضری ہوتی تو اکثر نعت خوان اعلیٰ حضرت کی نعتیں سناتے۔ اور سامعین سے داد وصول کرتے۔ یہ ''مرکزی مجلسِ رضا'' کی علمی خدمات کے اثرات تھے کہ بچہ بچہ آشنا ہو رہا تھا یہ مرکزی مجلس رضا کے تاثرات تھے جس سے ہر شخص متاثر ہو رہا تھا۔ مرکزی مجلس رضا کے پیچھے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کی شبانہ روز محنت تھی جو اپنے برگ و بار لا رہی تھی۔

''مرکزی مجلس رضا'' نے حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کی نگرانی میں ہزاروں نہیں بلکہ آج تک سولہ لاکھ کتابیں شائع کر کے ملک کے گوشے گوشے میں تقسیم کیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا کہ ایک ایک کتاب دس دس بار چھپتی اور ہر ایڈیشن دس دس ہزار کا چھپتا۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب کی ان خدمت سے نظر انداز ایک نابغہ روزگار شخصیت کا نام جسے Neglected genious of the East کہا جاتا تھا ہر شہر، ہر قصبہ، ہر قریہ ہر علاقہ میں پہنچنے لگا۔

''جھوم جھوم اٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستاں''

مجھے یاد ہے کہ ریڈیو پاکستان پر اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نعت پڑھنے پر پابندی تھی۔ معاندین رضا کے پراپیگنڈے کا یہ اثر تھا کہ کسی سرکاری تقریب میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نعت پڑھنا دشوار تھا۔ علامہ اقبال، حفیظ جالندھری اور مولانا ظفر علی کا کلام پڑھا جاتا اگر کہیں کوئی پروگرام منیجر اجازت دے بھی دیتا تو ساتھ ہی کہتا کہ امام احمد رضا کے نام والا مقطع نہ پڑھنا تاکہ مخالف لوگ امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ کا نام سن کر اعتراض نہ کریں مگر حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کی مسلسل کوششوں اور ''مرکزی مجلس رضا'' کے اشاعتی شعبہ نے اتنا کام کیا کہ ملک کے گوشے گوشے سے

ع ''مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام''

کی دلنواز صدائیں فضاؤں میں گونجنے لگیں۔ ریڈیو، ٹی وی پر بھی اعلیٰ حضرت کی نعتیں
پڑھی جانے لگیں۔ سرکاری تقریبات پر ''حدائق بخشش'' کے صفحات گونجنے لگے۔ کوچہ
وبازاران دلنواز نغموں سے معمور ہو گئے جو ''حدائق بخشش'' کے صفحات میں چھپے ہوئے
تھے۔ حکیم صاحب کی محنت رنگ لائی، گویا دبستان کھل گیا۔

ایک وقت تھا کہ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کو کوئی نہیں جانتا تھا مگر جب حکیم
صاحب نے فاضل بریلوی جیسے Neglected genious of the East
کو متعارف کرانے میں زندگی کا بہترین حصہ وقف کر دیا تو جہاں اعلیٰ حضرت مجدد مائۃ
حاضرہ امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام لیا جائے حکیم صاحب ساتھ کھڑے نظر
آتے ہیں۔ پاکستان کے گوشے گوشے میں اعلیٰ حضرت کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ اپنے
بیگانے اعلیٰ حضرت کا ذکر کرتے تھے تو اس ذکر کے ساتھ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری
کی خدمات کا ذکر ہوتا۔ پاکستان سے نکل کر جب حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری نے
ہندوستان کے علمائے کرام کو لٹریچر مہیا کیا تو اعلیٰ حضرت کو ماننے والے علماء کرام حکیم
محمد موسیٰ صاحب امرتسری کو فاضل بریلوی کا دامن پکڑے ہوئے پاتے۔ حکیم صاحب
اگر میں غلط نہیں، تو مجھے کہنے دیجیے کہ حکیم صاحب نے فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ پر ایک بھی
کتاب نہیں لکھی، ایک مضمون بھی نہیں لکھا، ایک مقالہ بھی نہیں لکھا، ایک شعر بھی نہیں
لکھا مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل بریلوی کے افکار ونظریات کے ترجمان حکیم محمد
موسیٰ صاحب امرتسری ہی ہیں۔ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پہچان حکیم محمد موسیٰ صاحب
ہیں۔ امام اہلِ سُنّت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی اذاں حکیم محمد موسیٰ صاحب ہیں بلکہ میں یہ کہنے
کی اجازت چاہوں گا کہ مجدد اہلِ سُنّت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شان اور اعلیٰ حضرت کی
جان حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری ہی ہیں۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری کبھی بریلی
نہیں گئے، عرس رضا پر حاضری نہیں دی، مزار کی زیارت نہیں کی، اعلیٰ حضرت کی
لائبریری نہیں دیکھی، مدرسہ منظر اسلام میں داخلہ نہیں لیا، جماعت رضائے مصطفیٰ کی

رکنیت حاصل نہیں کی مگر یوں لگتا ہے جیسے حکیم محمد موسیٰ امرتسری اعلیٰ حضرت کی مسجد
بریلی کے مینار پر کھڑے اذان دے رہے ہوں۔

حکیم صاحب نے وقت کے بڑے بڑے دانشوروں کو اعلیٰ حضرت پر لکھنے پر
آمادہ کیا، وقت کے بلند پایہ شعرا سے مناقب لکھوائے۔ یونیورسٹیوں کے پروفیسروں
اور عدالتوں کے سربراہوں سے مقالے لکھوائے، پاکستان اور ہندوستان کے بڑے
بڑے اہلِ قلم سے مضامین لکھوائے اور یوں خیابانِ رضویت کو سیراب وشاداب کر دیا
جسے آج ہر شخص محسوس کرتا ہے۔

ایک وقت آیا حکیم صاحب نے ''مرکزی مجلس رضا'' کے کام کو پختہ بنیادوں پر کھڑا
کرنے کا ایک منصوبہ بنایا۔ انہوں نے چند مستعد احباب کی ایک مجلس بنائی جس میں
دنیادار بھی تھے، اہلِ علم بھی تھے، دکاندار بھی تھے اور مولوی بھی تھے۔ اس مجلس نے اشاعتی
کاموں کے ساتھ ساتھ مستقل ادارے بنانا شروع کر دیئے۔ چاہ میراں میں ایک مسجد کی
بنیاد رکھی جسے ''مسجد رضا'' کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اس کا سنگِ بنیاد رکھنے کے لیے
عاشقانِ رضا اور خانوادہ رضا کے چند علماء ومشائخ آئے اور مالی تعاون میں حصہ لیا۔
تھوڑے عرصہ میں ''مسجد رضا'' مکمل ہوگئی، مسجد کے ساتھ ایک لائبریری قائم کی اور اس
میں کثیر تعداد میں کتابیں سجادی گئیں اور ہر پڑھے لکھے کے لیے دعوت مطالعہ کا اعلان کیا
گیا۔ علاقہ کے غریب، مسکین لوگوں کے لیے ایک کلینک قائم کیا گیا جو مفت علاج کی
سہولتیں بہم پہنچاتا۔ ان اقدامات پر اپنے تو اپنے بیگانے بھی حیران رہ گئے۔ وہ دیکھتے کہ
تہی دست سینوں کی ایک جماعت، بے وسائل درویشوں کے چند ایک افراد آگے آئے
اور اتنا بڑا کام کر رہے ہیں۔ یہ مال یہ دولت، یہ اخراجات، یہ انعامات، یہ مراعات کہاں
سے آ رہی ہیں۔ بیگانوں اور بے خبر لوگوں نے اسے ''امریکہ کی امداد'' کہہ کر مطعون کیا،
اپنوں نے اسے دست غیب کہا مگر ان کا کاروان آگے بڑھتا گیا۔

حکیم صاحب ایک درویش صفت انسان ہیں۔ نہ جبہ ودستار، نہ مسند ووقار، نہ

مال کی خواہش، نہ زر کی تمنا مگر جب دکانداروں اور افلاس کے مارے ہوئے لوگوں نے آپ کے اس عظیم کام کو دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گئے۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب ایسے عالم میں بیمار ہو گئے اور ایک سال تک صاحب فراش رہے۔ اس ایک سال کے اندر اندر دکانداروں، اراکین اور زر پرست مولویوں نے آپ کی مجلس کو اس بے دردی سے پامال کیا کہ دردمند لوگوں کو حیرت ہوئی۔ حکیم محمد موسیٰ صاحب امرتسری جب صحت یاب ہو کر آئے تو شکستہ دل تھے، شکستہ خاطر تھے، شکستہ منزل تھے۔

آج وہ عمر کے اس حصہ میں ہیں جب انسان کی رفتار مکمل سست پڑ جاتی ہے۔ آلام و مصائب کے طوفانوں میں ہیں، اپنوں اور بیگانوں کے زخموں سے شکستہ دل ہیں، مگر آج بھی ان کی مجلس میں علم و عرفان کی بات چلتی رہتی ہے۔ حکیم صاحب کی ان بیس سالہ خدمات کا یہ اثر ہے کہ آج پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں ایسی مجالس قائم ہو چکی ہیں جو امام احمد رضا کے افکار کو پھیلا رہی ہیں اور مرکزی مجلس رضا کے کام کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ آج برِ صغیر میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ پر جو کتاب لکھی جاتی ہے اس میں حکیم محمد موسیٰ امرتسری کی ان خدمات کا اعتراف ہوتا ہے جو انہوں نے اپنی زندگی کی توانائیاں صرف کر کے سرانجام دی تھیں۔ آج اعلیٰ حضرت پر ہزاروں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، سیکڑوں سکالرز امام احمد رضا پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں حاصل کر چکے۔ ہزاروں دانشور ادارے قائم کر چکے ہیں مگر ان سب ترقیوں کا کریڈٹ حکیم محمد موسیٰ امرتسری کو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ انہیں تا دم قیامت سلامت رکھے، زندگی بھر صحت مند رکھے، ان کے احباب، ان کے عقیدت مند، ان کے فیض یافتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے حلقہ بگوش رہیں اور ''مرکزی مجلس رضا'' کی اشاعتی سرگرمیاں زندہ و پائندہ رہیں۔

(''جہانِ رضا'' اگست ۱۹۹۷ء)



رجال الغیب کون ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی مشکلات دُور کرنے کے لیے اپنے، خاص بندوں، کا ایک ایسا لشکر تیار کیا ہے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ لوگ نہ تو دنیا کے کاروبار میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور نہ ہی تجارت وزراعت میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اللہ کی مخلوق کی خدمت کیلئے مامور ہیں اور لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں۔ انہیں، رجال الغیب، اولیائے مستورین، عباداللہ، کہا جاتا ہے رجال الغیب کا ایک اپنا وسیع جہان ہے، ایک "خفیہ نظام" ہے یہ ایک نہ نظر آنے والی دنیا ہے، اس دنیا میں میں غوث ہیں، قطب ہیں، ابدال ہیں، اوتاد ہیں، افراد ہیں اور ابرار ہیں۔ پھر ان رجال الغیب کے مختلف مناصب، مقامات اور درجات ہیں جو اپنے اپنے دائرے میں رہتے ہوئے کام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کی دعاؤں سے بادل برستے ہیں، کھیتیاں سرسبز ہوتی ہیں، بحر و بر کی رونقیں ہوتی ہیں۔ پھر کائنات ارضی پر ہونے والے انقلابات انہی کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق خفیہ امور سرانجام دیتے ہیں اور مخلوق خدا کی خدمت کرتے ہیں۔ اگر وہ ذرہ بھر غافل ہو جائیں تو م ملکات درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے ان، رجال الغیب، سے حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقاتیں، اقطاب عالم کے شب و روز اور ابدال و اوتاد کی خفیہ خدمات کا تذکرہ بھی سامنے آئے گا، آپ اس کتاب کا مطالعہ کریں گے تو آپ دنیائے تصوف کے عرفانی سمندروں کے اُن یواقیت و جواہر کی روشنیاں پائیں گے جو آپ کے دلوں کو روشن کر دیں گی اور ان مردان خدا کی ملاقات کے لیے آپ کے دل و دماغ بے تاب ہو جائیں گے۔

پیرزادہ اقبال احمد فاروقی